اوراقِ پریشان

چودھری محمد مصطفٰے حسین بسمل لکھنوی

قیمت عہ/ فی جلد

باہتمام محمد عسکری الواعظ صفدر پریس میں چھپی

پرنٹر :- الواعظ صفدر پریس ۱۶ کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ

پبلشر :- چودھری عباس حسین پسر جناب چودھری تسمل صاحب مرحوم
۴۳ پاٹانالہ لکھنؤ

نوٹ :- درج ذیل مقامات سے "اوراق پریشان" مل سکتا ہے -

۱- مدرسۃ الواعظین کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ - ۲- دلاور حسین - اسٹاف پورٹر امرت بازار پتریکا - ۲۳ بی - ایبٹ روڈ لکھنؤ - ۳- خادم رضا خان یونین ٹریڈرز ۱۹ جگت نرائن روڈ لکھنؤ - ۴- جنرل الکٹرک اینڈ ریڈیو امپوریم ۱ لاٹوش روڈ لکھنؤ ۵- نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ - ۶- کتابی دنیا نظیر آباد لکھنؤ - ۷- ادبستان گوئن روڈ لکھنؤ - ۸- گلستان گوئن روڈ لکھنؤ - علاوہ انکے دیگر کتب فروش دکانوں سے یہ کتاب مل سکتی ہے



عالیجناب راجہ محمد امیر احمد خانصاحب
دام حشمتہ و اقبالہ آف محمود آباد



عالیجناب مہاراجکمار امیر حیدر خانصاحب
دام حشمتہ

انتساب

از رشحۂ قلم حضرت حجۃ الاسلام جناب تاج العلماء مولانا سید محمد زکی صاحب قبلہ مجتہد العصر والزمان

باسمہٖ سبحانہٗ یہ مجموعہ کلام موسوم بہ "اوراق پریشاں" جو عمدۃ الشعراء عالیجناب چودھری مصطفٰے حسین صاحب بسمل مرحوم و مغفور کا طبع ہو رہا ہے دور حاضر و مستقبل کیلئے ایک بہترین و نایاب ادبی شاہکار ہے۔ جناب بسمل صاحب اپنی حیات ہی میں اسے طبع فرمانا چاہتے تھے اسی مقصد کے پیش نظر مرحوم اپنی وفات سے ایک دو روز قبل مدرسۃ الواعظین میں میرے پاس تشریف لائے ــــ اور دوران گفتگو میں فرمایا کہ میری دلی تمنا ہے کہ یہ مجموعہ کلام قدردان علم و اہل علم، رفیع المرتبت جلیل المنزلت عالیجناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب دام حشمتہم اور ان کے برادر خورد مستطاب عالیجناب مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں صاحب دام اقبالہم کے نام نامی سے معنون اور منسوب ہو ان حضرات کی خدمت میں یہ کلام پیش کر چکا ہوں میری ہمت افزائی اور بہت قدر و منزلت فرمائی اور اصرار فرمایا کہ یہ مجموعہ کلام ضرور شائع کیا جائے۔ مرحوم کے انتقال کے بعد مرحوم کے صاحبزادے جناب عباس حسین صاحب میرے پاس آئے اور چاہا کہ مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ چند سطریں میں لکھدوں۔ بیشک مرحوم کا کلام اردو ادب کی بہترین خدمت ہے اور میرے نزدیک دین کی بھی ان قصائد کیوجہ سے جو حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام کی شان میں اس مجموعہ کلام میں پیش کئے گئے ہیں۔ امید ہے ارباب ذوق قدر و منزلت کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائینگے۔ والسلام سید محمد زکی عفی عنہ

آل سرکار نجم العلماء (رح) متولی منتظم ادارہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔ مورخہ ۱۸ / فروری ۱۹۵۶ء

گذارشِ احوالِ واقعی

چودھری محمد مصطفےٰ حسین صاحب تبسمؔ لکھنوی تعلقدار پیدا ہوئے اور تعلقدار رہے۔ یہ بات اور ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ۳۴ سال بغیر تعلقہ کے گذارے۔ ۱۱ شوال المکرم ۱۳۱۲ھ بروز جمعہ خوابِ عدم سے آنکھ کھولی اور ۲۹ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ کو اس دارِ فنا سے آنکھیں پھیر لیں۔ زندگی کے اس ۷۰ برس کے دوران میں ۳۳ برس تک اپنے والد جناب چودھری شیخ محمد کاظم حسین صاحب تعلقہ دار غازی پور ضلع لکھنؤ کے سایۂ عافیت میں ناز و نعم کی دولت لوٹی۔ اسی قلیل عرصہ میں کالون تعلقدار کالج لکھنؤ میں میٹرک تک تعلیم پائی۔

والد کے انتقال کے بعد چودھری صاحب کی دُنیا میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ دس برس کے قلیل عرصہ میں علاقہ جو پہلے ہی سے مقروض تھا، تلف ہوا اور عزیز و اقارب کی نگاہیں بدلیں۔ یہ دنیا اُن کے لئے بد سے بدتر ہوتی گئی اور آخر کار اُنھیں قبل از وقت گور کے کنارے کر دیا۔

میں نے نہ تو اُنکی تعلقہ داری کا دور دیکھا، نہ محمود آباد کی ریاست میں حکومت کا زمانہ۔ لیکن بزرگوں سے سُنا ضرور ہے کہ چودھری صاحب ایک جوان صالح ہونیکے باوجود بہت حد تک رنگین مزاج ضرور تھے اُن کے والد گو شاعر نہ تھے لیکن اُن کی شعر فہمی ضرور اس کمال تک پہونچ چکی تھی کہ غالبؔ اُن کا ہیرو بن گیا تھا۔ عہد طفلی ہی میں چودھری صاحب کے کان غالبؔ کے کلام سے آشنا ہو چکے تھے اور اُن کی زندگی کے دورِ آخر میں غالبؔ ان کے دل و دماغ پر اتنا قبضہ کر چکا تھا کہ وہ بھی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح اسکے قائل تھے کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک مقدس وید۔ دوسرا دیوانِ غالبؔ" وہ اس ایرانی کے ہم آہنگ تھے جس نے غالبؔ سے غالبؔ کیلئے یہ کہا تھا "آن قدم ساق خوب ی گوید"

شاعری کے اس ابتدائی ذوق کو اور موسیقی سے گہرے لگاؤ کو عنفوانِ شباب میں عشق کی ٹھوکر نے عظیم تقویت پہونچائی۔ یہ رومان کامیاب ہوا بھی تو اس طرح جیسے گُل کا ثبات۔ جب اسکا طلسم ٹوٹا تو اُن کی دنیا ب زندگی کے تار تار بکھر گئے اب اُنکی شاعری میں دل کی پکار شامل ہو چلی اور زندگی اُنکے لئے صرف غم ہی غم بن گئی۔

تعلقہ ختم ہو نیکے بعد چودھری صاحب کے بھائی مہاراجہ محمود آباد اُنھیں محمود آباد لے گئے اور اُن کے دل بہلانے

کیلئے ریاست کا کچھ انتظام ان سے متعلق کر دیا لیکن چودھری صاحب کی خود دار طبیعت ریاست کے سم آمیز ماحول کو زائد دن تک گوارا نہ کر سکی۔ آخر محمود آباد بھی ان سے اُن کے علاقہ کی طرح چھوٹا۔ لکھنؤ دوبارہ اُن کی جائے قیام بنا لیکن اب کی اصطلاح کہ جس شہر میں وہ تعلقہ دارانہ حیثیت سے دربار میں کرسی نشین ہوتے۔ وہاں خود اپنے اور اپنے خاندان کے پیٹ پالنے کی فکر دامنگیر تھی۔

وہ میرے والد مرحوم کے احباب میں سے تھے اور اس جہت سے میری ابتدائی تعلیم انکے سپرد ہوئی۔ انھوں نے مجھے کبھی ماسٹر کی حیثیت سے نہیں پڑھایا۔ وہ میرے لئے ایک شفیق استاد اور بڑے باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہ دور بھی ختم ہوا اور گو اب چودھری صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل آفس کی کوآپریٹو سوسائٹی میں ملازم ہو گئے تھے لیکن پریشانیاں دو گونہ سے صد گونہ ہو گئیں۔ کہاں وہ عیش و عشرت جب نیند اُن کی تھی، دماغ ان کا تھا، راتیں اُن کی تھیں۔ یہ جب بھیا جی گنپت راؤ سے سیکھی ہوئی ہارمونیم پر اُنگلیاں "دستِ مضارب" کی طرح چلتی تھیں۔ رنگین تانوں کو رنگین تر اور المیہ گانوں کو غمگین تر بنانے کی محمود کوششیں شامل ہوتی تھیں ــــــ اب فکر معاش کی سختیاں آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کی مستقل کوششیں، عارضی وصل کے بعد ہجرت دائمی ایسے مہیب مسائل سامنے تھے۔ ان سے مقابلہ کرنے کیلئے چودھری صاحب کے پاس صرف شعر گوئی کی سپر تھی۔ وہ آخری سانس تک سپر انداختہ نہ ہوئے گو مصائب کے وار اکثر اتنے کاری ہوئے کہ سپر میں در آنے کے بعد انکے دل و دماغ کو بھی بہت حد تک بیکار کر دیا۔

اس زمانے میں وہ بہار صاحب مرحوم سے استفادہ کرتے تھے گو اس زمانہ میں شاعری لکھنؤ کے مخصوص رنگ کی حامل تھی۔ لیکن پھر بھی چودھری صاحب کے کلام میں ایک انفرادیت پیدا ہو چلی تھی۔ دفعتاً بہار صاحب کا انتقال ہوا۔ چودھری صاحب کے افکار بھی روز افزوں ہوئے۔ انھوں نے پیٹ پالنے کی جو نوکری کی تھی عرصہ تک وہ اپنے تئیں اس فریب میں مبتلا نہ رکھ سکے۔ نوکری اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ بالآخر انھوں نے اسکو بھی لات ماری اور اپنے تئیں رازق حقیقی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ابتدائی شاعری جس میں عنفوان شباب کی اُمنگیں اور ارمان شامل ہوں گے نہ ہم تک پہونچی اور نہ اُن کے مجموعہ میں کہیں اسکا تذکرہ ہے۔ غالباً یا تو وہ سب کی سب اس طرح تلف ہوئی کہ اُن کے ذہن سے محو ہو گئی تھی یا وہ کسی خاص مصلحت سے ہم لوگوں کو سنانا نہیں چاہتے تھے۔

اب وہ زمانہ آیا کہ ہم لوگ اپنے اوقات کا زائد حصہ ایک مخصوص ریسٹوران میں گذارتے تھے۔ احباب کی ایک مختصر صحبت تھی جو روزانہ ریسٹوران میں شب کو قائم ہوتی تھی اور جس کا واحد مشغلہ یہی تھا کہ اشعار پڑھے جائیں اور اُن پر بے لاگ تنقید ہو۔

ہر شخص کو ہر شعر کا مطلب بتانا ضروری تھا۔ اس طرح غالبؔ اور میرؔ کا چیدہ کلام سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اکثر ایک ہی شعر کئی کئی دن تک معرضِ بحث رہتا تھا۔ چودھری صاحب اس بزم کے رُوحِ رواں تھے۔ وہ اپنا کلام ہم لوگوں کو سناتے اور انتہائی خندہ پیشانی سے ہم لوگوں کی بے لاگ تنقید سنتے ـــــ اُن کی شاعری اب ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی اور اب اُنھیں اس امر کی فکر ہو چلی تھی کہ تخئیل میں ندرت ہونا لازمی ہے۔ طرزادا کے ساتھ وہ تخئیل کو جزو لاینفک سمجھتے تھے۔

اب وہ اپنا کلام مولانا صفیؔ کو دکھانے لگے تھے۔ مولانا مرحوم نے چودھری صاحب میں بالغ نظری پیدا کر دی۔ وہ کبھی تخئیل میں تبدیلی نہیں فرماتے تھے بلکہ یوں ہی سی لفظی تغیر و تبدل سے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتے تھے ـــ اس دور میں اُن کی بیشتر غزلیں غالبؔ کی طرحوں پر ہوتی تھیں۔ وہ عام طور سے ان طرحوں میں کامیاب غزلیں کہہ لیتے تھے۔ یہ غزلیں خاص کاوشوں کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ وہ ہر شعر کو بار بار کہتے تھے اور جب وہ ان کی بضاعت سے باہر ہو جاتا تھا تو وہ مجبوراً اُسے یوں ہی چھوڑ دیتے تھے۔

اکثر احباب اُنکی شاعری کو ان کی زندگی کا مرثیہ کہتے تھے۔ اُن کے کلام کو اکثر ادیبوں نے حزنیہ شاعری کی تحت میں لیکر ناقابلِ اعتنا سمجھا۔ کچھ لوگ اسلئے ناراض تھے کہ قنوطیت غالب ہوگئی ہے اور کچھ اسلئے کہ وہ "کھوکھل" ہوتا ہے۔ غرض مختلف احباب کی مختلف رائیں تھیں اور اسمیں شک نہیں کہ ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ چودھری صاحب ان سب لوگوں کی رائے سنتے تھے اور ہنس دیتے تھے۔ کبھی کبھی جب ہم لوگ انھیں بہت پریشان کرتے تھے تو وہ مسکرا کر کہہ دیتے تھے کہ میں اپنی شاعری میں اب جوانی کہاں سے لاؤں۔ میں تو وہی کہہ سکتا ہوں جو میرے مشاہدے میں ہر وقت آتا ہے عشق اور عاشقی اکتسابی نہیں اور میں تو اپنے چالیس برس کے عشق کو بہت حد تک بھول بھی چکا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

آخر عمر میں وہ سلام، قصیدہ اور نعت بھی کہنے لگے تھے اور اکثر نعتیہ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ رسولِ مقبول صلعم سے انھیں خاص عشق تھا اور آپکا نام مبارک آتے ہی اُن کی آنکھیں اسطرح نم ہو جاتی تھیں جیسے حسینؑ مظلوم کے تذکرہ سے۔ میں نے اُنھیں اکثر رسولِ اکرمؐ کے تذکرہ پر بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے۔ اُن کی رباعی جو اس مجموعہ کے صفحہ گیارہ پر ہے ان کے عقیدے کی شاہد ہے۔ انھیں بشارت ہو چکی تھی اور خواب میں حضرت رسولِ اکرمؐ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر چکے تھے۔

ان کے کلام کی اس صنف کو مولانا علی نقی صاحب نے بہت سراہا تھا اور مولانا ہی کی ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس صنف کلام کی طرف خاص طور سے متوجہ ہو چکے تھے۔ گو وہ مولانا ناصر حسین قبلہ کے مقلد تھے اور انکا تمام خاندان مولانا مرحوم اور ان کے والد بزرگوار کا مقلد تھا مگر وہ اپنے خیالات میں سختی سے کسی خاص عقیدے والے گروہ کے تابع نہ تھے۔ باوجود شدید بیماری کے جو عرصہ سے انکے دامنگیر تھی وہ اکثر مجالس میں شریک ہوتے تھے اور پابندی کیساتھ کربلا۔ عاشور اور چہلم میں جایا کرتے تھے ایک عرصہ کے بعد ہم لوگوں نے اب کی انکی چہلم میں عدم موجودگی محسوس کی۔

ان کی تمنا تھی کہ ان کی زندگی میں ان کا کچھ کلام شائع ہو جائے اور گو اکثر احباب اسکے لئے آمادہ تھے لیکن آخر میں انکی غیرت اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوئی۔ ہم لوگوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنا کلام جمع کریں اور بالآخر بدقت و خرابی جمع ہوا لیکن اسکا بیشتر حصہ تلف ہو گیا یا دوسروں نے اسے اپنا لیا۔ میں اب بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں اس مجموعہ میں کوئی شعر ایسا نہ نکل آئے جو دانستہ یا نادانستہ دوسروں کی ملک ہو چکا ہو۔ لیکن چونکہ میں اور کچھ مخصوص احباب انکے تیس برس کے کلام کا مصرعہ مصرعہ سن چکے ہیں لہٰذا میں اسے اپنی غلطی نہ سمجھونگا کہ وہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

موت سے چند روز پہلے انکی زندگی میں ایک عجیب انقلاب آ گیا تھا، اُن کے فرزند اکبر پاکستان سے آ گئے تھے اور اس مجموعہ کو چھپوانے کا سارا انتظام کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اسکا بھی انتظام کر دیا تھا کہ آئندہ ایک مستقل رقم ماہ بماہ انکو ملا کرے چودھری صاحب بے انتہا خوش تھے، دفعتاً اُنکے پُرانے امراض اچھے ہو گئے تھے، اُنکے چہرے کی شکنوں میں ایک خاص رونق آ گئی تھی، اُن میں استادہ آب کا سکون و قرار پیدا ہو گیا تھا —— ہاں اتنا ضرور سوچتے تھے کہ جب سب پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں تو ان کی زندگی کا مشغلہ کیا ہوگا۔ قدرت نے اسکا عجیب حل پیش کر دیا۔ زندگی کی آخری رات میں وہ راجہ صاحب کسمنڈہ کے یہاں مجلس میں شریک ہوئے اور حسب دستور دس گیارہ بجے گھر ہوئے، کھانا وغیرہ کھا کر لیٹے۔ گھر کے لوگ ناقل ہیں کہ رات کو انہیں ڈیڑھ یا دو بجے چارپائی پر بیٹھے ہوئے سگریٹ پیتے دیکھا گیا تھا۔ صبح بیدار ہونے کے بعد جب انھیں ناشتہ کرنے کیلئے جگایا گیا تو پتہ چلا کہ کارساز حقیقی نے ان کی زندگی کا آخری مسئلہ حل کر دیا تھا ؎ بے قراری سے جب نجات ملی ؛ دلِ بسمل کی زندگی نہ رہی "

اُستاد معظم مولانا ابو الفضل حضرت شمس لکھنوی نے کیا اچھی تاریخ کہی ؎

بن گئی ہے دل پہ نقشِ کالحجر
چودھری بسمل کی مرگِ ناگہاں

رکھتے تھے پہلو میں اک شاعر کا دل
انکے دل کا درد تھا دردِ جہاں

مردِ مومن تھے یہ شیدائے حسینؑ
کیوں نہ ان پر مرتضیٰ ہو مہرباں

پائی تھی شبیرؑ سے تعلیمِ صبر
غم اُٹھا کر کی نہ بھولے سے فغاں

جب محرم کی ہوئی انتیسویں
چھا گئیں ہر سمت غم کی بدلیاں

کیا قیامت خیز تھا پچھلا پہر
چھوڑا ہی مرحوم نے جب جہاں

دے خدا اولاد کو صبرِ جمیل
ہو میسر مرثیہ گو کو جناں

رہ گئے دنیا میں سہے ہیں غم بہت
اُٹھیں روزِ حشر یا رب شادماں

شمس لکھ دو ئے الم سے سال فوت
"شاعرِ شیریں زباں طوطیِ لساں"

١٣٧٦+١
١٣٧٧ھ

"احقر دلاور حسین"

تعارف

از:۔ حضرت نیاز فتحپوری

جناب بسمل لکھنوی "غزل" کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں" غزل کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہم اُسے سنیں تو ایسا محسوس کریں کہ شاید یہ ہماری ہی آواز ہے، ہمارے ہی دل کی بات ہے، ہمارے ہی جذبات ہیں اور کچھ ہیں اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔ اور جناب بسمل کی غزلوں کو سن کر ہم پر یہی کیفیت طاری رہتی ہے۔

شاعری میں غزل ہی وہ صنف سخن ہے کہ خیال اور زبان دونوں کی صداقت و ہم آہنگی اگر ہم اُس سے چھین لیں تو وہ کچھ نہ رہے ــــــ لیکن ان دونوں کا اجتماع بڑی خداسازبات ہے، بڑی قیمتی ودیعت ہے فطرت کی اور اسمیں شک نہیں کہ قدرت نے بسمل صاحب کو یہ دولت بخشنے میں بڑی سیر چشمی سے کام لیا ہے۔

لکھنؤ عرصہ تک صنعت اور ایہام کی شاعری میں مبتلا رہا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دبستانِ دلی کی شاعری بھی اپنی معنوی خصوصیات کھو چکی تھی اسکے بعد رد عمل ضروری تھا اور ہوا لیکن دلی میں نہیں لکھنؤ میں اور اس کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔

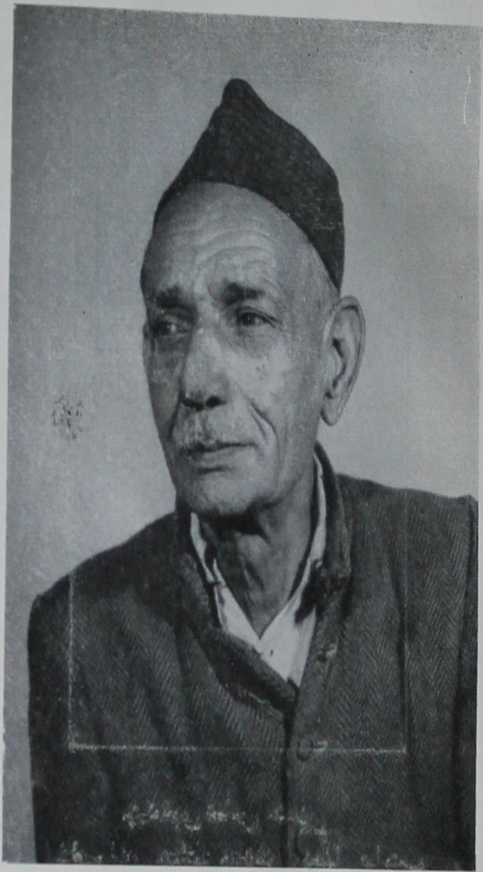
بسمل صاحب کو شاعری کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں، کیونکہ نہ وہ اکھاڑے کے شاعر ہیں نہ ریڈیو کے، لیکن جن حضرات کو اُن کے کلام سننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بسمل کتنا اچھا کہتے ہیں۔ ان کا کلام، زبان کی صفائی، بیان کی روانی، جذبات کی صداقت اور پاکیزہ خیالی کا بڑا دلکش امتزاج ہے ــــــ اسقدر دلکش کہ ہم اُسے شعر سے زیادہ "غناء محض" بھی کہہ سکتے ہیں۔

وہ کبھی کبھی مجھ پر کرم فرماتے ہیں اور جب اپنا کلام سناتے ہیں تو مجھے بے اختیار عرفی کا ــــــ "تنہا ملول بودن و تنہا گریستن" یاد آجاتا ہے۔

میں انھیں یہ دُعا تو نہ دوں گا کہ "خدا انھیں خوش رکھے"، کیونکہ خدا جسکو خوش رکھتا ہے۔ اُس کو شاعر نہیں رہنے دیتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہیں جبتک ایسے شعر کہہ سکتے ہیں۔

نیاز فتحپوری

۵ فروری ۔ ۱۹۵۷ء



چودھری محمد مصطفیٰ حسین بسملؔ لکھنوی

۱۸۹۳ء ـــــــــ ۱۹۵۷ء



چودھری عباس حسین
خلف اکبر جناب چودھری بسمل صاحب
مرحوم

ارشاد

سید العلما جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی

جو

پیام اسلام مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۶ء میں

شائع ہوا تھا۔

جناب چودھری مصطفےٰ حسین صاحب بسملؔ کا کلام جو مجھے کبھی کبھی سُننے کا اتفاق ہوا ہے بلاشبہ ایک ممتاز رفعت کا حامل ہے۔ ہمارے کتنے باکمال افراد گوشۂ گمنامی میں رہے جسمیں میرے خیال میں خود اُن کی بے پرواہی یا بے نیازی کا بہت بڑا دخل ہے۔ میرے خیال میں جناب چودھری صاحب بھی اسی طبقے میں داخل ہیں۔

(علی نقی النقوی)

نوٹ اڈیٹر الواعظ بحوالہ ستمبر ۱۹۵۶ء بسلسلۂ سلام

ناظرین الواعظ کو ہم آج ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر جناب چودھری تسبل لکھنوی کے کلام فصاحت التیام و بلاغت انتظام سے متعارف کرانے کا نادر موقعہ حاصل کر رہے ہیں اگرچہ جناب ممدوح ارباب ذوق کے حلقے میں محتاج تعارف نہیں لیکن ہمارے بہت سے ناظرین جو بیرون ہند مقیم ہیں یا ہندوستان کے دور و دراز شہروں کے رہنے والے ہیں ان کے لئے یہ سلام جو بارگاہِ عقیدت امام حسین کا عطیۂ خاص ہے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم ثابت نہ ہوگا۔

جناب ممدوح زاد کمالہ چودھری کاظم حسین صاحب مرحوم تعلقدار پلہری ضلع بارہ بنکی کے چشم و چراغ اور لسان القوم مولانا صفی لکھنوی مرحوم کے شاگرد رشید ہیں۔

(اڈیٹر)

اللہ اکبر

احساس وفا کو ہمہ گیری دیدے
شاعر کو انداز امیری دیدے
اے رب سلاطین تری بخشش کے نثار
بسمل کو مدینے کی فقیری دیدے

بسمل لکھنوی

غزلیات

یارب کسی سے چھین کے مجھکو خوشی نہ دے
جو دوسروں پہ بار ہو وہ زندگی نہ دے

ناقابلِ عبورِ نظر تیرگی نہ دے
یا پھر مری نگاہ میں بھی روشنی نہ دے

مجبوریاں بڑھا نہ اسیرِ حیات کی!
پابندیوں کے ساتھ غمِ زندگی نہ دے

دم بھر کی بات ہے یہ غمِ زندگی اگر
محشر کے دن گناہوں کی شرمندگی نہ دے

وہ رنج کیا جو ہم کو بتائے نہ رنگِ دہر
وہ درد کیا جو ایک نئی زندگی نہ دے

یارب گذر بسر کیلئے رزق چاہیئے
مانگوں بھی میں تو عیش کے ساماں کبھی نہ دے

دردِ دلِ حزین بہ تقاضائے رنج و غم
اُٹھے اگر تو مہلتِ چارہ گری نہ دے

وہ عشق کیا جو رنج و مصیبت کے ساتھ ساتھ
غمگین دل کو نعمتِ سنجیدگی نہ دے

جس کا نتیجہ غم کے سوا اور کچھ نہ ہو
اے ناشناسِ رنج مجھے وہ خوشی نہ دے

معلوم ہوتا حال اگر اس جہان کا　　کہتا ہزار بار مجھے زندگی نہ دے
عسرت مری قبول کرے بھی تو اے خدا　　مانگے ہوئے چراغ میں تو روشنی نہ دے

بسمل وفورِ غم میں لکھے راز ہی اگر
دستِ جنوں کو حسرتِ جامہ دری نہ دے

زندگی تیرا ماجرا کیا ہے　　ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے
عمر گذری ہے نا امیدی میں　　یہ نہ پوچھو کہ آسرا کیا ہے
دیکھئے جائیے مآلِ حیات　　بندہ پہ خدا بھی ہوا کیا ہے
زیست کٹتی ہے اک سزا کی طرح　　یہ نہیں جانتے خطا کیا ہے
شعبدہ زندگی کا ہے ورنہ　　روح کا تن سے واسطا کیا ہے
زندگی جب وبال ہو جائے　　موت آجائے تو برا کیا ہے
بن کے انجان وہ اگر پوچھیں　　کیوں بتاؤں کہ مدعا کیا ہے
وقت پڑنے پہ وہ بھی جانیں گے　　جو نہیں جانتے خدا کیا ہے

چارۂ کارِ جرمِ سرتابی
سجدۂ عجز کے سوا کیا ہے
اپنے بیگانے ہو گئے جس میں
ایسے عالم کا پوچھنا کیا ہے
بے ثباتیٔ دیر سے آگے
گردشِ بختِ نارسا کیا ہے
بے قراری سکون سے بدلی
تنِ بسمل میں اب رہا کیا ہے

سوزشِ زخمِ دل بصد انداز
مرحمت ہے، تری نگاہِ ناز
ہے تخیل کی طاقتِ پرواز
حسبِ منشائے جلوہ گاہِ ناز
جب سے قسمت نے سوتراہی کی
غمِ جانکاہ بن گیا دمساز
رنگِ دنیا کے پوچھنے والو
زندگی کا بدل گیا انداز
آشیانہ ہی فکر کا باعث
آشیانہ ہی مانعِ پرواز
قطعِ حسرت کی موت نے ورنہ
آرزوؤں کا سلسلہ تھا دراز
بندگی وجہ التفات بنے
یہ کریمی کی شانِ بندہ نواز

آئینہ جب سے رُوبرو آیا　　حُسن کچھ اور ہو گیا غمّاز

جس کے دم سے ہے تیرگی قائم　　وہ حقیقت ہے روشنیٔ مجاز

شمعِ محفل کو پوچھتا پھر کون　　کام آتے اگر نہ سوز و گداز

دار پر بھی رہی بڑائی کی　　زیرِ خنجر بھی پڑھ چکے ہیں نماز

ہے غنیمت جو اہلِ دل اب تک　　سُن رہے ہیں ضمیر کی آواز

اپنے طرزِ بیاں میں اے بسمل
کاش غالب کا ہوتا کچھ انداز

گردش نہیں قیام نہیں یا فنا نہیں　　دم بھر کی زندگی حوادث میں کیا نہیں

دل کی نظر سے رازِ حقیقت چھپا نہیں　　یہ اور بات ہے کہ۔ کوئی دیکھتا نہیں

ہمرازِ کائنات ہے ہر شعبۂ حیات　　سب سے جدا ہے اور کسی سے جدا نہیں

وابستۂ غرض جو نہ ہوتی یہ زندگی　　کوئی کسی کی بات کبھی پوچھتا نہیں

محوِ جمالِ یار کسی سے بتائے کیا　　گلشن میں کیا ہے اور بیابان میں کیا نہیں

اِطلاقِ سنگ و خشت بھی ہوتا نہیں تو پھر — اُس دل کو کیا کہیں جو وفا آشنا نہیں
ہم اُسکو بھول جائیں قیامت کی بات ہے — جو بھول کر بھی ہم کو کبھی بھولتا نہیں
یوں راہِ زندگی سے گذرتے ہیں قافلے — منزل سے جیسے دور کا بھی واسطا نہیں
جینے کی آرزو میں گرفتار ہے جہاں — دُنیا کا حال کیا ہے کوئی دیکھتا نہیں
جس آشیاں کی وجہ سے دوبھر ہو زندگی — اچھا ہوا وہ میرے بنائے بنا نہیں
وہ انقلاب آئے کہ محبوسِ رنج و غم — آزادیٔ خیال کا قائل رہا نہیں
جلوے کی کیفیت کو سرِ منزلِ شہود — وہ کیا بتائے ہوش بھی جسکے بجا نہیں
راس آئے گی کبھی تو بہارِ چمن ہمیں — مانا کہ آج اپنے موافق فضا نہیں

انجام زندگی سے ہراساں ہو کس لئے
بسمل ابھی تو شورِ قیامت اُٹھا نہیں

زندگی راہ پر نہیں آتی — منزل ابتک نظر نہیں آتی
دل اُلجھتا ہے اُس طرف جاتے — جس طرف سے خبر نہیں آتی

ایسا جادو ہوا ہے رنگِ مجاز	کہ حقیقت نظر نہیں آتی
موت آتی تو ہے بشر کو ضرور	ہاں مگر وقت پر نہیں آتی

عافیت جس کا نام ہے بسملؔ
اس جہاں میں نظر نہیں آتی

نقدِ دل لوٹ چکی چھین چکی جاں مجھ سے	مطمئن پھر بھی نہیں گردشِ دوراں مجھ سے
حسرت و یاس کا یہ حال الٰہی توبہ	دردِ الفت بھی چھڑانے لگا داماں مجھ سے
جان اندیشے سے آزاد ہو دل فکر سے دور	کل کا چھٹتا یہ چھٹے آج گلستاں مجھ سے
دو قدم اور مرا ساتھ دے اے ہمتِ دل	اب بہت دور نہیں کوچۂ جاناں مجھ سے
بعد کی بات ہے گلزار و قفس کی ایجاد	جبکہ آباد ہوا عالمِ امکاں مجھ سے
موت بھی جس سے شبِ ہجر تغافل برتے	کوئی کیوں ہو مرے اُس حال کا پرساں مجھ سے
زیست کے ساتھ رہا میری رہائی کا سوال	مرتے دم تک نہ چھٹا گوشۂ زنداں مجھ سے
چند روزہ یہ گلستان و قفس ہیں ورنہ	میں بیاباں سے جدا ہوں نہ بیاباں مجھ سے

وائے تقدیر کہ ہر رنج و خوشی کے ہمراہ
خیر اور شر بھی ہے دست و گریباں مجھسے
میری تدبیر نے یک سوئی کا عالم بدلا
کاش جلتا نہ چراغ شبِ ہجراں مجھسے
قید سے چھٹنے کا ساماں ہوا جب بسمل
وائے تقدیر کہ بدظن ہوا دوراں مجھسے

جو ادھر جلالتِ حُسن نے سر طور پردہ اُٹھا دیا
تو ادھر جسارتِ دید نے مرے حوصلے کو بڑھا دیا

مری بزمِ عیش و نشاط کا ہے مدار دل کے چراغ پر
جسے جس نے چاہا جلا دیا جسے جس نے چاہا بجھا دیا

ہیں اگرچہ شکلوں میں مختلف مگر اصل سب کی ہے ایک ہی
یہ کمالِ قدرتِ حُسن ہے جسے جیسا چاہا بنا دیا

ہوئیں کوششیں تو ہزار ہا مگر آشیاں نہ بنا سکیں
مری حرصِ خانہ طراز نے مجھے منہ قفس کا دکھا دیا

یہی زندگی کا ہے ماجرا، وہی ابتدا، وہی انتہا
مجھے خاک ہی سے بنا دیا، مجھے خاک ہی میں ملا دیا
اس اندھیری راہ میں عشق کی میں بھٹک رہا تھا اِدھر اُدھر
مگر اک تجلیِ حسن نے مجھے راستے پہ لگا دیا

وہ سفینہ جس پہ مدار تھا تہِ آب ہوتا بُری طرح
یہ کہو تلاطم بحر نے مجھے رُخ ہوا کا بتا دیا
مِری ضو سے سب کو غرض رہی مِرے کام کوئی نہ آسکا
وہ چراغِ بزم نشاط ہوں جسے بیکسی نے بُجھا دیا

یہ سمجھ لے سہلِ نکتہ داں کہ روش نے طور و طریق کی
جو بنا دیا تو بنا دیا جو مٹا دیا تو مٹا دیا

بتائیں جو یہ کہتے ہیں خدا کیا | اُنھیں کا خود وجودِ خود نما کیا
سحر کے وقت تارے کی ضیا کیا | چراغ زندگی بُجھتا ہوا کیا

قفس کے ڈر نے دلچسپی بڑھا دی
وگرنہ باغ کیا اُس کی ہوا کیا

ملے جو کچھ ہمیں دستِ کرم سے
غنیمت ہے وہی کم کیا سوا کیا

نشیمن ہے الٰہی یا قفس یہ
بنانا چاہتے تھے کیا بنا کیا

سمجھئے جلوۂ خارِ بیاباں
ادائے زندگی کُو خوشنما کیا

تماشا ہے چراغِ زندگانی
سرِ محفل جلا کیا اور بُجھا کیا

گرفتارانِ دُنیا خاک سمجھیں
کہ ہے ناکامیوں کا مدّعا کیا

جب اپنی زندگی ہے چند روزہ
تو پھر یہ درد کیا اسکی دوا کیا

پڑی کیونکر بنائے بے ثباتی
ازل کے روز آخر یہ ہوا کیا

دلِ بسمل پہ کیا گذری لحد میں
عزیزانِ جہاں سے واسطا کیا

آجائیے کہ ابتک امکانِ زندگی ہے
پھولوں میں رنگ و بو ہے تاروں میں روشنی ہے

آغاز جس کا طوفاں انجام بے بسی ہے
اے زندگی کے مالک یہ کیسی زندگی ہے

یا پھول کھل رہے تھے یا شمع بُجھ رہی ہے — اک وہ ہوا چلی تھی اک یہ ہوا چلی ہے

اے رسم و راہِ دُنیا یہ بات شرم کی ہے — اک گھر میں تیرگی ہے اک گھر میں روشنی ہے

کتنا گراں توازن یہ امرِ واقعی ہے — سو عیب ایک جانب اک سمت مفلسی ہے

محتاج زندگی کو ہر شے کی ہے ضرورت — اِک چیز ہو تو کہدے اس چیز کی کمی ہے

میری نظر سے دیکھیں دُنیا کی تیرہ بختی — جو لوگ کہہ رہے ہیں محفل میں روشنی ہے

فرطِ غم و الم سے آئے زباں پہ کیونکر — وہ حسرتِ تکلم جو دل ہی میں رہی ہے

صبحِ ازل سے لیکر تا حشر و نشرِ دُنیا — وہ راز ہی رہیگی جو بات راز کی ہے

آنکھوں میں اشکِ حسرت دلمیں ملالِ منزل — میں ہوں خیالِ غم ہے انجام رہروی ہے

ناچار بن کے دیکھیں نیرنگیٔ زمانہ — کیا اسلئے ہماری آنکھوں میں روشنی ہے

قائم یوں ہی رہیگا تسلسل نظامِ عالم
دُنیائے رنگ و بو میں جبتک دو رنگی ہے

یہ تو کہتے ہیں شادماں ہوتے — غم نہ ہوتا تو ہم کہاں ہوتے

دل کو برباد کر دیا ورنہ — اپنے قبضے میں دو جہاں ہوتے

بے نوائی سے اپنی بہتر تھا — بے مکاں ہوتے بے نشاں ہوتے

ایک جلوہ ہزار تاثیریں — کِس کے کِس کے مزاجداں ہوتے

رنگِ گلشن سمجھنے والے کیوں — متمنّیِ آشیاں ہوتے

ایک حالت پہ گر جہاں رہتا — دل کے ارماں وبالِ جاں ہوتے

نہ محبت میں جان سے جاتے — نہ حقیقت کے رازداں ہوتے

تھک کے بیٹھے ہیں جادۂ غم میں — چلتے رہتے تو ہم کہاں ہوتے

فتنہ و شر بپا زمانے میں — بہ تقاضائے این و آں ہوتے

بات بنتی اگر نفس والے — ایک دل ہوتے اک زباں ہوتے

پردۂ دوستی میں جو ملتے — غم وہ ناقابلِ بیاں ہوتے

برق ہوتی اگر نہ سدِّ راہ — آشیانوں پہ آشیاں ہوتے

کاش دُنیا کو چاہنے والے
دلِ بسمل کے رازداں ہوتے

غم اگر بے مثال ہو جائے — بخدا لازوال ہو جائے
اس کی نگینیوں کا قائل ہوں — جو چمن پائمال ہو جائے
رنگِ دُنیا اگر بدل بھی سکے — کیوں مرے حسبِ حال ہو جائے
پوچھ لیں وہ اگر مری حالت — زندگی کا سوال ہو جائے
غمِ عصیاں بڑھے مگر اتنا — خلشِ انفعال ہو جائے
شکوۂ قدر و منزلت ہے اگر — آدمی باکمال ہو جائے
مقصدِ آئینہ گری بھی یہی — راز دارِ جمال ہو جائے

وہ نہیں پوچھتے تو کیوں بسمل
موت پُرسانِ حال ہو جائے

مد و جزرِ بحرِ غم بڑھتا ہی ساحل کے قریب — زندگی دشوار ہو جاتی ہے منزل کے قریب
روشنی سی کچھ نظر آنے لگی دل کے قریب — کاروانِ زندگی شاید ہے منزل کے قریب
ہمت افزائے جنوں ہے اب بھی صحرا کی ہوا — اُڑ کے آتے ہیں بگولے اب بھی محمل کے قریب

زندگی اپنی گذرتی ہے مگر اس طور سے
درد اُٹھتا ہے کبھی دل میں کبھی دل کے قریب

حُسن کی رعنائیاں ہر قیدِ امکانی سے دُور
عشق کی پابندیاں طوق و سلاسل کے قریب

عزمِ مستحکم، طلب صادق ہو تو اے ہم نفس
دُوریٔ منزل بھی ہو جذباتِ کامل کے قریب

دیکھئے انجام کیا ہو اُس کے شوقِ دید کا
ہے بپا شورِ قیامت جسکی محفل کے قریب

سر اُٹھایا ہے ستم نے اور کوئی پُرساں نہیں
یہ تماشا ہو رہا ہے کوئے قاتل کے قریب

کیا کرے وہ اعتبارِ زندگی جس نے کہ خود
کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل کے قریب

مرگِ ناکامی کے ہاتھوں سے ملے جس کو نجات
کیوں کوئی جائے بھلا اور ایسے بسمل کے قریب

کاش قربت کا سبب دُوریٔ منزل ہو جائے
بے بسی میری ترے رحم کے قابل ہو جائے

اللہ اللہ یہ دلِ تنگیٔ دامانِ بہار!
سر چھپانا بھی مرے واسطے مشکل ہو جائے

اسی اُمید پہ جھیلے ہیں مصائب ہم نے
دلِ ناکام ہمارا کسی قابل ہو جائے

صاحبِ عقل و فراست ہے وہ مجبورِ وفا
تجکو دل دیکے جو انجام سے غافل ہو جائے

چھیڑنے والے دلِ زار کو اتنا تو نہ چھیڑ
تذکرہ اُس کا ترے ذکر میں شامل ہو جائے

وائے تقدیر کہ ہے اپنی محبت کا مدار
اُس خوشی پر جو مبدل بہ غمِ دل ہو جائے

کون پھر کس کی محبت کے سہارے پہ جیے
موسمِ گُل میں اگر خونِ عنادل ہو جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ کام آئے غریب الوطنی
تھک کے گر جائیں جہاں پر وہیں منزل ہو جائے

موت آئے کہ نظامِ غمِ دُنیا بدلے
کسی صورت تو سکونِ دلِ بسمل ہو جائے

ذکرِ سوزِ دل کریں تو پائیں کیا
حالتِ زخمِ جگر دکھلائیں کیا

بات کہنے کی ہو، کہہ دیں ایک بار
قصۂ رنج و الم دُہرائیں کیا

رہبری کرتا ہے دُوری کا خیال
پیش پا اُفتادہ منزل پائیں کیا

کون جانے وقتِ استفسارِ غم
حالِ دل اہلِ وفا بتلائیں کیا

آرزوئے دید منزل ہے مگر
روند کر حسرت کشوں کو جائیں کیا

بڑھ کے چلتے ہیں تو ہوتا ہے خیال
چند روزہ زیست پر اترائیں کیا

اے مصیبت کھو چکے صحت، اور اب — پیشِ خالق دل بھی کھو کر جائیں کیا

ہم سے بسمل حضرتِ غالب کا رنگ

کوششوں پر بھی غزل میں لائیں کیا

جمالِ فصلِ گل جب روکشِ رنگِ خزاں ہوگا — نہ قدرِ باغباں ہوگی نہ ذکرِ آشیاں ہوگا

کہیں نغمے کی صورت میں کہیں جانِ فغاں ہوگا — زبانِ حال سے ہر قصۂ ماضی بیاں ہوگا

صعوباتِ سفر کم ہوں اگر معلوم ہو جائے — کٹیں گی رات غربت کی کہاں پر، دن کہاں ہوگا

ہے دل میں حسرتِ تعمیر بھی یہ بھی سمجھتے ہیں — نشانِ ہستی جو ہو ہوم اک دن بے نشاں ہوگا

مشقت ہی پہ کیا موقوف اس بزمِ حوادث میں — جفاکش ہر بلائے زندگی کا رازداں ہوگا

بہار آئیگی پھر گلشن میں لیکن اے چمن والو — جہاں اپنا تھا اب کی دوسروں کا آشیاں ہوگا

اگر فکرِ رسا یونہی رہی تحقیق پر مائل — تو اک دن رازِ محرومیِ قسمت بھی عیاں ہوگا

جسے ہوگا ذرا بھی اعتبارِ زندگی بسمل

وہی دل خون روئے گا وہی دل نوحہ خواں ہوگا

دردِ جب تک کہ لا دوا نہ ہوا
زندگی کا بھی آسرا نہ ہوا

حوصلے سے جو بڑھ گیا میرے
کبھی پورا وہ مُدّعا نہ ہوا

حُسنِ وحدت کے سب کرشمے ہیں
ایک کی شکل دوسرا نہ ہوا

کب سے ہم جسکے انتظار میں ہیں
حشر وہ آج تک بپا نہ ہوا

ذرّہ برباد ہو گیا لیکن
مرکزِ ثقل سے جدا نہ ہوا

جزو کُل سے نہ مل سکا چُھٹ کر
بندۂ بندہ رہا، خدا نہ ہوا

باغِ فطرت میں پھر بہار آئی
زرد پتّا مگر ہرا نہ ہوا

موت اور زندگی میں ربط ہے کیوں
آجتک طے یہ مرحلہ نہ ہوا

مجھ سے بسمل کے واسطے شبِ غم
کیا ہوا کیا بتاؤں کیا نہ ہوا

بُلبُل نے گُل نے رنگِ گلستاں سے خار سے
سیکھا ہے دیدہ ور نے بہت کچھ بہار سے

وحشت کا راز پوچھے اُس وضعدار سے
دامن جو سی رہا ہے گریباں کے تار سے

ہے بہترین بخششِ افضالِ کردگار
دل کا لحاظ چاہیئے ہر اعتبار سے

سرسبز کس طرح ہو گلستانِ آرزو
آتش برس رہی ہے نسیم بہار سے

دل سادگی پسند طبیعت وفاشعار
اور سابقہ ہے اک نگہِ ہوشیار سے

جب سے ہوا ہے شکوۂ آزارِ زندگی
ٹکرا رہی ہے دل کی صدا کوہسار سے

کیا ہوگا تیرا حال اگر ہم نہیں رہے
یہ پوچھتا ہے گردشِ لیل و نہار سے

ہر وقت رنجِ دہر ہے ہر دم خیالِ مرگ
اُکتا گیا ہوں زندگیٔ مستعار سے

بسملؔ بھی دیدِ دوست کی حسرت کرے مگر
سر اُٹھ سکے تو کثرتِ عصیاں کے بار سے

دائے بربادی کہ وہ بے ساز و ساماں ہو گئے
جن کی پابوسی سے ویرانے گلستاں ہو گئے

حوصلے صرفِ طوافِ کوئے جاناں ہو گئے
سنگِ راہِ شوق میرے دل کے ارماں ہو گئے

زندگی کے بند جب محبت سے گریزاں ہو گئے
زندگی کے مرحلے محشر بہ داماں ہو گئے

یاد تازہ کیجئے کیوں ایسے افسانوں کی پھر
جو رہینِ منتِ خوابِ پریشاں ہو گئے

خونِ انسانی کی قیمت وہ سمجھ پائیں گے کیا — داغہائے دل سے روشن جن کے ایواں ہوگئے
زندگی کی لاکھ صبحیں ان کی قسمت پر نثار — جو اندھیرے زینتِ گورِ غریباں ہوگئے

مال و زر جانے کا بسملؔ دکھ نہیں غم ہے تو یہ
آدمیت اٹھ گئی ناپیدِ انساں ہوگئے

کسی کے جلوۂ رنگیں نے جانِ بوستاں ہوکر — متاعِ قلبِ بلبل لوٹ لی گل میں نہاں ہوکر
کہیں کیا ایسے تنکوں کو جو سدِ راہ بنتے ہیں — کہیں پر بجلیاں بن کر کہیں پر آشیاں ہوکر
انھیں کی ناتوانی اب توانائی کی ضامن ہے — جو وابستہ ہیں منزل سے غبارِ کارواں ہوکر
اب اس سے اور زائد انقلابِ پستی کیا ہوتا — قفس کی سیر کرتے ہیں چمن کے رازداں ہوکر
غمِ جاناں سے پوچھو حال اس آزردہ جاں کا — اٹھایا زندگی کا بار جس نے ناتواں رہ کر
وہ عالم کی خبر جو اسکے آگے کہہ نہیں سکتے — کہاں تک اور جائینگے ابھی ہم اور کہاں ہوکر
ہے پیشِ نظر ہر سو مناظر صنعِ قدرت کے — مآلِ زندگی حاصل ہوا بے خانماں ہوکر
بتانا چاہیئے اے روشنیٔ وادیٔ ایمن — مجھے بے موت مارا کس نے آنکھوں سے نہاں رہ کر

وجودِ زندگی خطرے میں پڑ جاتا شبِ فرقت
اگر وہ پوچھ لیتے حالِ بسمل مہرباں ہو کر

شریکِ حال اگر تیرگی نہیں ہوتی
جہانِ غم میں کبھی روشنی نہیں ہوتی

جو شمعِ بزمِ حوادث جلی نہیں ہوتی
ادائے دہر میں یہ دلکشی نہیں ہوتی

وہ شوخ اپنی جفاؤں سے باز آئے کیوں
مری وفاؤں میں جبتک کمی نہیں ہوتی

روش یہ دہر کی اس دورِ جانفشانی میں
ہنسی تو آتی ہے لیکن خوشی نہیں ہوتی

نجات پائیں دلِ اضطراب سے کیونکر
کہ بندگی کی طرح بندگی نہیں ہوتی

کسی کے دل کو دکھانا تو سہل ہے لیکن
یہ بات وہ ہے جو آئی گئی نہیں ہوتی

سکون ہوتا ہے اک گونہ بے رخی کے ساتھ
نگاہِ ناز میں جب برہمی نہیں ہوتی

نشانِ قبر سے کیا فائدہ عزیز و جب
یہیں پہ ختم مری زندگی نہیں ہوتی

جنوں سے دہر میں بسمل کوئی نہ لیتا کام
جو منتہائے خودی بیخودی نہیں ہوتی

ذکرِ غم جبتک شریکِ داستاں ہوتا نہیں
دلگداز و دلنشیں کوئی بیاں ہوتا نہیں

داغِ دل منت کشِ آہ و فغاں ہوتا نہیں
اِک یہی آتش ہے وہ جسمیں دھُواں ہوتا نہیں

لازمِ گلزار کیونکر آشیاں ہوتا نہیں
کچھ نہ ہوتا گر زمیں پر آسماں ہوتا نہیں

اور بڑھ جاتا ہے جوشِ طاقتِ عزم و عمل
بارِ غم انساں اُٹھا کر ناتواں ہوتا نہیں

چھوڑ جاتا ہے جہانِ غم پہ ہستی کے نقوش
ذرہ مٹ جاتا ہے لیکن بے نشاں ہوتا نہیں

جھیلتا جبتک نہیں ہر سرد و گرمِ فصلِ گُل
آشیاں کہنے کے قابل آشیاں ہوتا نہیں

بخش کر مجھکو جہانِ خود روی کی زندگی
اور کیا ہوتا اگر وہ بدگماں ہوتا نہیں

کِس کا اِدراک اِک مسرت کیسا احساسِ خوشی
عالمِ غربت میں کوئی مہرباں ہوتا نہیں

یاد رکھئے قولِ بسمل اے عزیزانِ وطن
کارِ دُنیائے محبت میں زیاں ہوتا نہیں

زیست کے دن تو کیا گن ڈالے ہیں
ہم نے کاندھوں سے بوجھ اُتارے ہیں

چاند اُسکا ہے اُسکے تارے ہیں
جس نے گیسوئے شب سنوارے ہیں

لغزشِ پا ذرا خیال رہے ۔۔۔ بحرِ ذخّار کے کنارے ہیں

ہم سے پوچھو مصائبِ شبِ غم ۔۔۔ ہم نے فرقت کے دن گزارے ہیں

آشیاں کی وہ قدر کیا جانیں ۔۔۔ جن کی مٹھی میں پَر ہمارے ہیں

دین و دنیا کو یوں سمجھ لیجے ۔۔۔ ایک دریا کے دو کنارے ہیں

پوچھنے والے مبتدا و خبر ۔۔۔ بے سہارے تھے بے سہارے ہیں

جان و دل نذرِ معصیت کر کے ۔۔۔ کس زباں سے کہیں تمہارے ہیں

اللہ اللہ یہ فریبِ نگاہ ۔۔۔ اِک نظر اور سو نظارے ہیں

مدّ و جزرِ حیاتِ فانی کو ۔۔۔ کیا سمجھ پائیں جو کنارے ہیں

زندگی لاکھ تفرقے ڈالے ۔۔۔ وہ ہمارے تھے اور ہمارے ہیں

دلِ بسمل کی خاک کے ذرّے
آسمانِ شرف کے تارے ہیں

یاد رکھیے بزمِ فانی کی خوشی اچھی نہیں ۔۔۔ خون کے آنسو جو رلائے وہ ہنسی اچھی نہیں

موت اچھی، ہر طرح کے رنج و غم اچھے، مگر
اے نگاہِ ناز تیری برہمی اچھی نہیں

جس میں کھپ جائے جہانِ ناز کا ہر شوخ رنگ
کون کہہ سکتا ہے ایسی سادگی اچھی نہیں

روشنی بھی کار آمد، تیرگی بھی کام کی
حد سے لیکن جو گذر جائے وہی اچھی نہیں

خود کو بے مایہ سمجھ رکھا ہے غم کو بے ثبات
اے ہجومِ یاس یہ دیوانگی اچھی نہیں

زندگی کو کیا کہے کوئی کہ ہنگامِ زوال
بے بسی اور بے کسی کی موت بھی اچھی نہیں

خوفِ تاریکی جلائے جس کو قبلِ شامِ غم
ایسی شمعِ بیخودی کی روشنی اچھی نہیں

اے نگہدارِ محبت اب ہے اس کا خیال
دردمندوں کیلئے غم کی کمی اچھی نہیں

میں سمجھتا ہوں ذریعہ ہے کسی کی یاد کا
لوگ کہتے ہیں کہ بسمل بے بسی اچھی نہیں

زنجیر نہ تھی زلفِ گرہ گیر سے پہلے
بیکار تھا زنداں مری تقدیر سے پہلے

بے حس تھا جہاں گردشِ تقدیر سے پہلے
بے کیف تھی دنیا غمِ دل گیر سے پہلے

دل کیسا، جگر کیسا، کہاں کا غمِ دنیا
کچھ بھی تو نہ تھا حسن کی تنویر سے پہلے

دل کش جسے رنگینیٔ فطرت نے بنایا — اِک سادہ ورق تھا مری تصویر سے پہلے
آما جگہِ ظلم و ستم کب نہ رہا دل — تھا درد جدائی خلشِ تیر سے پہلے
دم گھٹتا ہے جس وقت خیال آتا ہے بسمل
آزاد تھے ہم بندشِ تقدیر سے پہلے

کرتا رہا جو یوں ہی دل رہبری ہماری — منزل کریگی اک دن خود پیروی ہماری
آسودگانِ عالم بے فکر ہیں تو کیا غم — بدلے گی رنگ دنیا بے مائیگی ہماری
حالات زندگی نے بندہ بنایا ورنہ — کہتی تھی اور ہی کچھ ہم سے خودی ہماری
ہے رنج کی معاون، دام و قفس کی ضامن — دُنیائے رنگ و بُو سے وابستگی ہماری
مجبوریوں نے اپنی آخر یہ دن دکھایا — ہاتھوں سے دوسروں کے تربت بنی ہماری
دستِ جنونِ اُلفت شوقِ رفو میں یارب — کرتا رہیگا کب تک جامہ دری ہماری
منزل کا بار اُن کے کاندھوں پہ آپڑا ہے — راہوں کو کھل رہی ہے واماندگی ہماری
کچھ مہر و مہ نے چھینا کچھ تیرگیٔ شب نے — تاروں نے کسب کرلی کچھ روشنی ہماری

اوروں کا ذکر کیا ہے جب فکرِ آشیاں پر
پھولوں نے بھی اُڑائی بسملؔ ہنسی ہماری

دیر و حرم ہیں گبر و مسلماں لئے ہوئے
جاؤں کہاں میں دولتِ ایماں لئے ہوئے

نازل ہوئی ہے رنج کے ساماں لئے ہوئے
اِک زندگی ہزار غمِ جاں لئے ہوئے

غنچے کھلے ہوائیں چلیں آشیاں بنے
لیکن تغیرات کا امکاں لئے ہوئے

طے کر رہی ہے گردشِ دُنیا کی منزلیں
ذرے کی زیست حشر کا ساماں لئے ہوئے

ہم ڈھونڈتے ہیں منزلِ مقصد کی روشنی
تاریکیوں کا ہاتھ میں داماں لئے ہوئے

تیرِ نگاہِ ناز چلایا گیا مگر
اشکِ غم وفا سرِ مژگاں لئے ہوئے

اُس دل پہ بھی نگاہ رہے جبکہ بوئے گل
رخصت ہوا اعتبارِ گلستاں لئے ہوئے

منزل نے بڑھ کے تھام لئے راہرو کے پاؤں
بیچارہ تھک چکا تھا غمِ جاں لئے ہوئے

وحشت زدہ اچھال رہے ہیں جنوں کی بات
اِک دوسرے کا تارِ گریباں لئے ہوئے

رکھتا ہے ہم اسیروں پہ وحشت کی تہمتیں
ہاتھوں میں سنگ و خشت نگہباں لئے ہوئے

عشرت کدے سے اہلِ تغافل کو ایک دن
جانا پڑے گا حسرت و ارماں لئے ہوئے
شامِ فراق ہو کہ وہ بسملؔ کی زندگی
دونوں ازل سے ہیں غمِ ہجراں لئے ہوئے

بشر کو چاہیئے محتاطِ روزگار رہے
نفس کی آمد و شد سے بھی ہوشیار رہے
یہ کیا کہ وعدہ بہ فردائے روزگار رہے
تمام عمر قیامت کا انتظار رہے
عطا ہو ساغرِ صہبائے زندگی لیکن
نگاہِ فیض بہ اندازہ خمار رہے
دلِ غریب کو بھی خواہشِ نشیمن ہو
اگر یہ رنگ زمانے کا پائدار رہے
عیاں ہو برق کی صورت یہ کیا قیامت ہے
وہ روشنی جو پسِ پردۂ بہار رہے
بشر کے واسطے مشکل ہے اور بہت مشکل
تغیرات کی دنیا میں وضعدار رہے
وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے اے بسملؔ
کہ جس میں دل یہ بنے جان بیقرار رہے

دے کے برگشتہ مقدر کا سہارا اے دوست — تجھکو معلوم ہے انجام ہمارا اے دوست

زیست کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے — جو زمانہ تری فرقت میں گزارا اے دوست

دل کو دنیائے حوادث سے گزرنے کیلئے — کم نہیں تیری محبت کا سہارا اے دوست

بڑھتی جاتی تو ہے کشتیٔ محبت میری — ہوتا جاتا ہی مگر دور کنارا اے دوست

خوابِ غفلت سے کھلی آنکھ گلستاں میں مگر — اپنا جب کہہ کے مجھے تو نے پکارا اے دوست

رنج اس کا ہے۔ ملال اس کا ہے شکوہ اسکا — تیری دنیا میں نہیں کوئی ہمارا اے دوست

ہو چلا تھا دلِ بسمل کو گنہ کا احساس

کہ نمودار ہوا صبح کا تارا اے دوست

زندگی میں ہے کشش خوف و خطر ہونے تک — حادثاتِ شبِ غم پیشِ نظر ہونے تک

گرم ہنگامہ رہا، شمع جلی، شمع کے بعد — رنگ محفل کا بہ عنوانِ دگر ہونے تک

کسکی ہمت ہے کہ اس بزم کا نقشہ کھینچے — جو کہ سو رنگ بدلتی ہے سحر ہونے تک

کاوشِ ضبطِ حرارت تھی کہ خالق کی پناہ — دامنِ جوششِ جنوں خون میں تر ہونے تک

جز نشیمن کی ہوس حاصلِ گلشن نہیں کچھ
زندگی کام کی تھی خاک بسر ہونے تک

سامنے آنکھوں کے بجلی سی جو چمکی تو کیا
لطف جلوے کا ہے پابندِ نظر ہونے تک

رخنہ انداز ہے خود حالتِ زنداں لیکن
زندگی چاہیئے دیوار میں در ہونے تک

باغ ویرانے کی صورت ہی رہیگا بسمل
دلِ برباد کے ذرّوں میں اثر ہونے تک

صبحِ محشر کی شام ہے کہ نہیں؟
غم کی مدت تمام ہے کہ نہیں؟

جب یہ سوچا تو پھر سکون کہاں
گردشوں کو قیام ہے کہ نہیں؟

دشمنِ زیست مجھ سے وابستہ
یہ بتا تیرا نام ہے کہ نہیں؟

اپنی قسمت پہ رونیوالے دیکھ
غم کا اب احترام ہے کہ نہیں؟

کون جانے کہ گوشۂ تربت
عافیت کا مقام ہے کہ نہیں؟

دَور کی منقصت ہے یہ کہنا
میری قسمت میں جام ہے کہ نہیں؟

کوششِ زیست بزمِ فانی میں
ہوسِ بے مرام ہے کہ نہیں؟

رنگِ گلشن اگر ہے ایک حصار
تو نشیمن بھی دام ہے کہ نہیں؟

رنج و غم نیک و بد جزا و سزا
خوبیِ یک نظام ہے کہ نہیں؟

دوسروں کے کرم پہ جو گزرے
زندگی وہ حرام ہے کہ نہیں؟

خونِ سرمستِ زندگی ہو کر
بادۂ لالہ فام ہے کہ نہیں؟

ترکِ اُلفت کا مشورہ ناصح
نامۂ بے پیام ہے کہ نہیں؟

لفظ کہتے ہیں دل بتاتا ہے
دوست کا یہ پیام ہے کہ نہیں؟

پوچھئے کیوں کہ آتشِ گل میں
شعلۂ انتقام ہے کہ نہیں؟

شعر کہتا ہوں اس سے مطلب کیا
وہ پسندِ عوام ہے کہ نہیں؟

شکوۂ دہر نابجا بسمل
تجکو کچھ اور کام ہے کہ نہیں؟

جائے حیرت ہے کہ تن میں روح گھبرائی نہیں
ناگوارِ طاقتِ دل زندگی پائی نہیں

آنکھ میں آنسو اگر آئیں تو عزت پر بنے
زندگی برباد ہو جائے تو رسوائی نہیں

جب وہی گل ہو وہی بلبل تو اے جوشِ بہار
چہرۂ گلشن پہ کیوں پہلی سی زیبائی نہیں

ربطِ اُلفت ٹوٹ جانے کا ہو کیونکر احتمال
میرے اُنکے چار دن کی تو شناسائی نہیں

آج اس حالت کو پہونچایا ہے ضبطِ رنج نے
حسبِ مقدورِ وفا دل میں شکیبائی نہیں

سُو طریقے ہیں ادائے بندگی کے خلق میں
کارِ عند اللہ پابندِ جبیں سائی نہیں

میں وہ ناکامِ تمنا ہوں سرِ راہِ فنا
جسکی بربادی بھی آبادی کے کام آئی نہیں

وائے لاعلمی کہ اُس منزل سے ہمکو کام ہے
جس کی حالت آجتک ہمنے سمجھ پائی نہیں

جوشِ سیلابِ حوادث کو سمجھ رکھا ہے کھیل
کشتیٔ مقصد ابھی ساحل سے ٹکرائی نہیں

وہ ضیائے مہر و مہ ہو یا جمالِ برقِ طور
کورِ باطن نے کہیں سے روشنی پائی نہیں

دیکھکر رنگِ زمانہ حُسن کے پیغامِ وفا
جس کا دل قابو سے باہر ہو وہ سودائی نہیں

پوچھنے والے تری دُنیا میں یہ کیونکر کہوں
وہ اسیرِ بیکسی ہوں جس کی شنوائی نہیں

شاہدِ انجامِ بزمِ عیش ہو وقتِ سحر
خیر سے بسمل نے اتنی زندگی پائی نہیں

جادۂ گلرنگ میں کیفِ قدیمانہ کہاں
جس سے کچھ حاصل ہو رندوں کو وہ میخانہ کہاں

ارتقائی دور نے بدلا زمانے کا چلن
قیس سے نسبت تھی جسکو اب وہ ویرانہ کہاں

بن چکا سوزِ دلِ تسکینِ خاطر کا سبب
اب مری تابِ نظر کو فکرِ خسخانہ کہاں

حسن اور الفت کی دنیا میں بجز تفریق کار
اے ہجومِ نامرادی اپنا بیگانہ کہاں

عیش و عشرت کیف و مستی کی تو اک حد ہے مگر
زندگی کے میکدے میں غم کا پیمانہ کہاں

نقطۂ کن تفریق کا باعث بنا تو اس طرح
میرا افسانہ کہاں ہے اس کا افسانہ کہاں

غیر جب پوچھے تو اس دار العمل میں کیا کہوں
تختِ طاؤسی کہاں ہے اور تاجِ شاہانہ کہاں

اللہ اللہ یہ نیاز و ناز کی سرمستیاں!
دل کہاں ہے جاں کہاں ہے بزمِ جانانہ کہاں

انفرادی حیثیت کا جو علمبردار رہو
اے نگاہِ جستجو ایسا صنم خانہ کہاں

آتشِ پنہانِ غم کی حسرتیں پوری ہوئیں
یہ ہوا جانے کہ اب ہے خاک پروانہ کہاں

اپنی بربادی کو جو سمجھے خود اپنا ہی قصور
اے دلِ ناکام بسمل ایسا فرزانہ کہاں

طبلِ فوج و علم کو جاہ و حشم کے نشاں کہیں
کس منھ سے اپنی گندگی ہوئی داستاں کہیں

بجلی گرے اُسی پہ دمِ شورشِ بہار
ناکام زندگی کا جسے آشیاں کہیں!

یا وہ ہوا چلے جو بجھا دے چراغِ دل
یا وہ جگہ ملے جسے دارالاماں کہیں

اللہ جانے اُن کی مُرادِ دلی کا راز
جو منزلِ حیات کو بھی کارواں کہیں

دل کے تاثرات نہ لائیں بروئے کار
کب تک کسی میں سود کسی میں زیاں کہیں

ذراتِ دل کی طاقتِ تسخیر دیکھ کر
حیراں ہیں کہیں تو کسے ناتواں کہیں

آوردۂ بہار وہ تنکے ہیں باغ کے
صیدِ جفا قفس کی جنھیں تیلیاں کہیں

گمراہیوں سے کام رہے پھر تمام عمر
اِک صاحبِ نشاں کو اگر بے نشاں کہیں

حالِ خرابِ بسملؔ ناکام دیکھ کر
بیجا نہیں جو لوگ اُسے نیم جاں کہیں

ہے جس طرح زمیں کہیں آسماں کہیں
اے دل کہیں ہے اور نگہ مہرباں کہیں

اِک مُشتِ خاک اور یہ سامانِ امتحان
زنداں کہیں ہے دار کہیں ریسماں کہیں

اظہارِ حالِ زار یہ قدرت ہو کس طرح
جب دل کہیں دماغ کہیں جسم و جاں کہیں

اے باغباں ہمارے نشیمن کے پھیر میں
برباد ہو نہ جائے ترا گلستاں کہیں

رنگینیوں نے راہ کی روکا جگہ جگہ
لیکن تھما نہ توسنِ عمرِ رواں کہیں

تنکے چمن کے میں بھی جنوں اے ہوائے گل
مٹنے سے گر بچا ہو کوئی آشیاں کہیں

آتا ہے حسن کی ہیئتِ رفتار پہ زوال
رکتا ہے راستے میں وہی کارواں کہیں

دورِ خزاں میں یہ بھی غنیمت ہے ہمنوا
ملتا ہے فصلِ گل کا جو اب تک نشاں کہیں

امکانِ ضبط اپنی حدوں سے گذر گیا
اب حالِ دل بیان نہ کر دے زباں کہیں

دنیائے خیر و شر سے ہو تسمل نجات پھر
مٹ جائے کاش تفرقۂ این و آں کہیں

جب حدِ خیال سے حسرت گذر گئی
دیکھا جمالِ دوست جہاں تک نظر گئی

یہ بات اور ہے کہ بہ نوعِ دگر گئی
فریاد ہر غریب کی اُس تک مگر گئی

بے کیفیوں نے رنگ زمانہ بدل دیا
ناکامیوں سے طاقتِ قلب و جگر گئی

جذب و کشش سے پُر ہے فضائے بسیط دہر
نکلی جو منہ سے بات اِدھر کی اُدھر گئی

فطرت نے تا بہ حشر لیا خاک دل سے کام — مشکل سے میرے حال کی اُن تک خبر گئی
یہ سوچ کر ہوں راہِ محبت میں گامزن — منزل گئی، اگر یہ مری رہ گذر گئی
انجامِ کارِ عشق ہو کیا دیکھا چاہیئے — جب اشتیاقِ دید میں تابِ نظر گئی
پانی کی طرح بہتا ہے پُرساں نہیں کوئی — مُدت ہوئی کہ قیمتِ خونِ جگر گئی
انسانیت وہی ہے، وہی جستجوئے شوق — جو دوسروں کے واسطے کچھ کام کر گئی
خود داریوں نے دستکشی کا سبق دیا — فکرِ معاش لے کے مجھے دربدر گئی

دل اور جگر گئے تو گئے اپنے ہاتھ سے
زلفِ دوتائے یار تو بسمل سنور گئی

ناکام کر رہی ہے اُسی کی ادا مجھے — رحم و کرم نے جس کے یہ سب کچھ دیا مجھے
گلشن میں رنگ و بو نے مٹایا مرا نشاں — صحنِ قفس میں چھیڑ رہی ہے ہوا مجھے
کیونکر نہ اپنے دل سے لگائے رہوں وہ غم — یاد آ رہا ہے جس کے سبب سے خدا مجھے
باقی ہے سرزمینِ جفا خونِ دل سے تر — جس سمت لے کے جاتی ہے میری وفا مجھے

مدت ہوئی کہ قصۂ طوفاں ہوا تمام
لے ڈوبا اپنے ساتھ مرا ناخدا مجھے

میں ہوں نشارِ قہر ہے اور تیرگیٔ وقت
دو دن کی زندگی کا ملا یہ صلا مجھے

بھیجا تھا جس نے دانۂ ممنوع کی طرف
اب خوں رلا رہی ہے وہ میری خطا مجھے

نقش و نگارِ زیست ہے خواب اور خیال
برباد کر چکا دلِ غم آشنا مجھے

جب سے ہوا ہوں راہِ محبت میں گامزن
شکوہ کسی سے ہے نہ کسی سے گلا مجھے

میں بھی تباہیوں سے ڈروں اس جہان کی
جب میری حاجتوں سے ملے کچھ سوا مجھے

پیشِ نگاہِ دل ہے مآلِ شبِ فراق
آتی ہے ابتدا میں نظر انتہا مجھے

پھر میں تو اس جہاں کے قابل نہیں رہا
کہنے لگے ہیں لوگ اگر باوفا مجھے

جس سے نہ کوئی ربط ہو بسمل نہ کوئی کام
اب تو عزیز ہے وہی ناآشنا مجھے

گلشن میں مشتِ پر کا ٹھکانا کہاں نہ تھا
سبزہ تھا شاخِ گل تھی اگر آشیاں نہ تھا

دنیا مسرتوں میں برابر کی تھی شریک
لیکن کسی کے غم کا کوئی رازداں نہ تھا

سو سو طرح سے مجھکو بنانا بگاڑنا
فطرت کا مشغلہ بھا مرا امتحاں نہ تھا

اہلِ غرض نے اُس کا مصیبت رکھا تھا نام
جسمیں کسی کا کوئی نفس رائگاں نہ تھا

کشتیٔ دل کی تیزیٔ رفتار دیکھکر
مجکو خیالِ سیل و شمیم بادباں نہ تھا

منت کشِ رموزِ امانت بنا ضمیر
لیکن جو دل کا حال یہاں ہے وہاں نہ تھا

اے ناشناسِ رنج مری سرگذشت میں
کیا تیرا نام زیبِ سرِ داستاں نہ تھا

آنکھیں کھُلیں تو ہم کو سنبھلنا ہوا محال
وہ انقلاب آیا کہ جس کا گماں نہ تھا

آزادیوں کی راہ میں حائل رہی یہ بات
کُنجِ قفس میں ایک کا اک ہمزباں نہ تھا

احرام باندھا دیر و کلیسا کی سیر کی
اور وہ وہاں ملا کہ جہاں پر گماں نہ تھا

تھی رنجِ مستقل ترے بسمل کی زندگی
اچھا ہوا کہ اُس کا کوئی رازداں نہ تھا

بہارِ چمن جلوہ گر ہو رہی ہے
زمیں خونِ ناحق سے تر ہو رہی ہے

یہ حد ستم ہے کہ تعمیرِ زنداں
اسیروں کی امداد پر ہو رہی ہے

شبِ غم پر اس بات کا پوچھنا کیا — مری کس طرح سے بسر ہو رہی ہے

وہ راہیٔ منزل ہوں جس کی ابھی تک — کہیں شب کہیں پر سحر ہو رہی ہے

کریمی کی حد ہے کہ جلووں کی بارش — بہ اندازِ ذوقِ نظر ہو رہی ہے

بدلنے لگا غم کی دنیا کا نقشہ — مصیبت مری کارگر ہو رہی ہے

خموشی نمایاں اداسی فراواں — شبِ عیش گذری سحر ہو رہی ہے

محبت ہی مقصد محبت ہی حاصل — محبت ہی اب دربدر ہو رہی ہے

وہ صحنِ گلستاں قفس کی یہ تنگی — بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

غریبی کا عالم ہے گھر کی اداسی — نگہبان دیوار و در ہو رہی ہے

یہ شانِ کریمی کی حد ہے کہ بسمل
خطا پر خطا درگذر ہو رہی ہے

رنج و راحت کی کہانی اور ہے — حالِ دل کی ترجمانی اور ہے

اے نظامِ زندگانی ہوشیار — آج میرے دل نے ٹھانی اور ہے

حائل راہِ وفا رِ زندگی
ایک میری ناتوانی اور ہے

بجھ کے شمعِ دل یہ ثابت کر گئی
سوزشِ دردِ نہانی اور ہے

زیرِ عنوانِ بلائے ناگہاں
ہر نفس کی اک کہانی اور ہے

جانتا ہوں راہِ غربت کا مآل
میری منزل کی نشانی اور ہے

کانپتی تھیں جسکے ڈر سے بجلیاں
اُس نشیمن کی کہانی اور ہے

اب بھی قائم ہے نظامِ رنگ و بو
کیا قیامت کی نشانی اور ہے

دوستوں کی دوستی ہی اور شئے
دشمنوں کی مہربانی اور ہے

کہہ رہی ہے یہ ادائے زندگی
کچھ دنوں کی جانفشانی اور ہے

صبر بہتر ہے دلِ بسملؔ مگر
بیکسوں پر نوحہ خوانی اور ہے

سُرخی ہی مرے خونِ وفا کی گُلِ تر میں
گلزارِ محبت ہے حوادث کے اثر میں

آرام کے اسباب نہیں گو مرے گھر میں
پھر بھی وہ کھٹکتا ہوں زمانے کی نظر میں

شب خیر سے گذری ہے مگر دیکھیے کیا ہو — انداز قیامت کے ہیں آثارِ سحر میں
عشرت کدۂ عالمِ اسباب تھا کل تک — ہے حبس کا شمار آج نہ دیوار نہ در میں
یہ دن بھی دکھایا غمِ جانکاہ نے آخر — ٹانکے دیئے جاتے ہیں مرے زخم جگر میں
تعمیر قفس ہیچ ہے دُنیا کی روش ہیچ — ہے طاقت پرواز ابھی تک مرے پر میں
اندازِ وفا طمعِ جا طرزِ قناعت — کیا چیز نہیں شیوۂ امکان بشر میں
وہ بھی نہ ملا مجھکو سرِ راہِ مشقت — آرام جو ملتا ہے مسافر کو سفر میں
نیرنگیٔ امکانِ حوادث سے یہ ڈر ہے — تفریق نہ پڑ جائے کہیں قلب و جگر میں
محصورِ طلسمِ شبِ دیجور ہوں لیکن — ہے جلوۂ کونین مری حدِ نظر میں

یہ بات بھی تیرے لئے کچھ کم نہیں بسمل
تو قابلِ نفرت نہیں دنیا کی نظر میں

بڑے عزت کے لالے شان و شوکت کا نشان بدلا — مگر اہلِ رعونت کا نہ اندازِ بیاں بدلا
خداوندا یہ کیسی جستجو کیسی رسائی ہے — کہ منزل جب قریب آئی تو نظمِ کارواں بدلا

مری رفتار سے طے ہو گئیں راہوں کی دشواری
مرا احوال وقتی طور سے بدلا جہاں بدلا

ارے اے بلبلِ رنگیں نوا تجھ سے تو گُل بہتر
کہ جس کی زندگی کے ساتھ رنگِ گلستاں بدلا

اثر زائل ہوا کب رنگ و بو کی کارسازی کا
کرشمہ سازِ فطرت نے اگر اس کا نشاں بدلا

خودی میں بیخودی دیکھی جدھر دیکھا وہی تھا
دماغ جستجو کا جب خیالِ این و آں بدلا

سحر کی سرد مہری پر صبا کی اضطرابی پر
ہنسی غنچوں کو یوں آئی کہ نظمِ گلستاں بدلا

ہزاروں انقلاب آئے جہانِ شوق میں بسمل
مگر جس کی تمنا تھی وہ دورِ غم کہاں بدلا

مرے ضبطِ غم کا اثر دیکھ لینا
زمانے کو زیر و زبر دیکھ لینا

گرفتارِ حرصِ نشیمن خدارا
ذرا طاقتِ بال و پر دیکھ لینا

قیامت ہے اُس بُت کی محفل میں جانا
اور اپنا فروغِ نظر دیکھ لینا

عدم کا مسافر ہوں لازم ہے لیکن
سرِ راہ بھی اِک نظر دیکھ لینا

اگر زندگی ہے تو طورِ جہاں کو
بہ اندازِ نوعِ دگر دیکھ لینا

عقیدت کی منزل کا پہلا کرشمہ — کراماتِ حُسنِ نظر دیکھ لینا
قیاسات و فکرِ بشر کی یہ حد ہے — کہ سب کچھ سرِ رہ گذر دیکھ لینا
فریبِ بصارت ہے دھوکا یقیں کا — حقیقت کو پیشِ نظر دیکھ لینا

رُلا دے گا بسمل تجھے خوں کے آنسو
یہ ناسُورِ زخمِ جگر دیکھ لینا

احساسِ غمِ زیست رہا خوف و خطر تک — میں وقفِ صعوبات رہا ختمِ سفر تک
دیکھیں تو بہت سہل جو سمجھیں تو ہے مشکل — شبنم کی صبا خیز رسائی گُلِ تر تک
غم ہوگا نہ شب ہوگی نہ دلسوزیاں میری — دُنیا ہی بدل جائیگی ہنگامِ سحر تک
کہنے کو تو ہر رنگ کے جلوے ہیں چمن میں — دل جس پہ فدا ہو وہ نہیں حدِ نظر تک
ناواقفِ منزل ہوں مگر اسکا یقیں ہے — اک روز پہنچ جاؤنگا میں دوست کے در تک
اب مشغلۂ اشک فشانی بھی ہوا ختم — ہے تشنہ دہانی کا اثر قلب و جگر تک
یہ وقت کی خوبی ہے گرفتارِ بلا ہوں — ورنہ میرے قبضے میں تھے طوفانِ شرر تک

اُس بزمِ ستم ساز کے آداب نہ پوچھو
سہمی ہوئی اُٹھتی ہے جہاں تابِ نظر تک

رفتارِ ستم سمجھے کہ اندازِ شبِ غم
جو کچھ دلِ بسمل پہ گذرتی ہے سحر تک

جو یہ سمجھے تو پھر دشمن رہے کیوں باغباں میرا
خس و خاشاکِ گلشن سے بنا ہے آشیاں میرا

جہاں کے نیک و بد پر اب بھی ہے سود و زیاں میرا
تعین کی حدیں قائم کئے ہے درمیاں میرا

سلیقہ ہو تو سن لو سرگذشتِ زندگی میری
فضا نے آج تک محفوظ رکھا ہے بیاں میرا

ستم ڈھائے کہ اب تیوری چڑھائے باغباں لیکن
بنا ڈالی ہے تو نکھرے گا آشیاں میرا

نہ راہ رنج و غم ہوگی نہ یہ دشواریاں اُسکی
سرِ منزل پہونچ جائیگا جس دن کارواں میرا

وہ دن بھی آگیا آخر جہانِ کس مپرسی میں
زمانہ ڈھونڈھتا ہے اور نہیں ملتا نشاں میرا

وہ صحنِ رنگ و بو ہو یا قفس کی چار دیواری
نہ ہے کوئی یہاں میرا نہ تھا کوئی وہاں میرا

غنیمت جانئے جبتک متاعِ بے ثباتی سے
سہارا پا رہا ہے ارتباطِ جسم و جاں میرا

وفورِ بیکسی آخر یہ طرزِ زندگی کب تک
کہ حسیں کی حد سے امانِ دل ہے دھجیاں میرا

ہزاروں انقلاب آئیں گے دُنیائے جفا جو میں
نشاں جبتک نہ ہو جائیگا پھر سے بے نشاں میرا

وہ آئے حال بربادی کا میری پوچھنے لیکن
زمیں کا ذرّہ ذرّہ بنگیا جب رازداں میرا

ہنسو اہلِ چمن میری تباہی پر ہنسو لیکن
نہ یہ بھولو کہ مٹ مٹ کر بنا ہے آشیاں میرا

نہ کچھ ساغر کا حاصل ہے نہ کچھ بادہ کا حاصل ہے
جو عزمِ میکشی ہو جائے بسمل رائیگاں میرا

وقت کی قدر نہ کی منتظرِ جام رہے
اُن کو کیا کہیے جو میخانے میں ناکام رہے

جو کہ آغاز سے ناواقفِ انجام رہے
کیا بتائیں کہ کہاں صبح کہاں شام رہے

ایک کا ایک سے کوئی نہ کوئی کام رہے
عینِ فطرت ہے اگر جود و طلب عام رہے

اُس جفا کیش کے ہم بندۂ بے دام رہے
جس کی نظروں میں صدا موردِ الزام رہے

آفریں اُنکو جو منت کشِ آلام رہے
کوششیں کرنے پہ بھی دہر میں ناکام رہے

وہ نفس کیوں مرے انجام کا آغاز بنے
جس پہ موقوف مری موت کا ہنگام رہے

وہ تکالیف مجھے جان سے دل سے منظور
جن کے آگے مرے اللہ کا بس نام رہے

اے فلک میں نہ رہوں صحنِ چمن میں کیوں
جب کہ صیاد رہے، دانہ رہے، دام رہے

تو رہے یا نہ رہے بزمِ ستم میں بسمل
تجھ سے بہتر ہے کہ تیرا کوئی پیغام رہے

غم و خوشی کے احاطہ میں بھی وہ آ نہ سکا
جو دل میں رہ نہ سکا آنکھ میں سما نہ سکا

غضب بھی وہ جسے طوفانِ نوح پا نہ سکا
کرم بھی وہ جو کفِ آرزو میں آ نہ سکا

نگاہ ناز کی شوخی سے ہیچ پا نہ سکا
نظر بچا کے چلا بھی تو دل بچا نہ سکا

دلِ غریب کی ہمت کبھی بڑھا نہ سکا
وہ انقلاب جو دنیا کو راس آ نہ سکا

یہ شامِ غم کا قلق تھا یہ بیخودی کا وفور
چراغ سامنے رکھا رہا جلا نہ سکا

ملال یہ ہے کہ اُجڑا وہ غیر کے ہاتھوں
میں آگ اپنے نشیمن میں خود لگا نہ سکا

چلا ہے برقِ سرِ طور کی تلاش میں وہ
جو ایک ذرّے کی طاقت کو آزما نہ سکا

میں کیا ہوں کچھ بھی نہیں ہوں مگر یہ یاد رہے
کہ میرے آگے فرشتہ قدم بڑھا نہ سکا

تغیرات کے امکان کا کچھ نہیں حاصل
زمانہ گرتے ہوئے کو اگر اُٹھا نہ سکا

عیاں ہوئی بھی تو یہ اُس کے اختیار کی حد
کہ دل میں آگ لگا دی مگر بجھا نہ سکا

نتیجہ اُس دلِ بسملؔ کا دیکھئے کیا ہو
جو اپنے درد کو بھی رہنما بنا نہ سکا

رنج کا پہلو بدلنے انقلاب آیا تو کیا
پھر زمانہ چین کا پا در رکاب آیا تو کیا

زندگی کے میکدے میں انقلاب آیا تو کیا
بعد میرے دور میں جامِ شراب آیا تو کیا

جل گئی کھیتی مزاجِ گرم فطرت سے اگر
اشکِ حسرت بھر کے آنکھوں میں سحاب آیا تو کیا

دیکھکر رنگِ زمانہ چھوڑ کر اپنا وطن
صحنِ گلشن میں کوئی خانہ خراب آیا تو کیا

پھر وہی راتیں اندھیری پھر وہی تاریکیاں
چار دن کی چاندنی بن کر شباب آیا تو کیا

مثلِ دُودِ شمعِ محفل اک پریشان حیات
تیری محفل سے رہا اضطراب آیا تو کیا

ظلم کا بازو جو شل رہتا تو ہم بھی دیکھتے
ناتوانوں پر زمانے کا عتاب آیا تو کیا

بسملؔ ناکام کی دنیائے دل بدلی تو کیوں
انقلابی زندگی میں انقلاب آیا تو کیا

کبھی تو نوعِ بشر معنیٔ وفا سمجھے
سکونِ دل سے محبت کا مدعا سمجھے

بشر کو چاہیئے ہمت کو رہنما سمجھے
نشانِ منزلِ مقصود زیرِ پا سمجھے

نفس کی آمد و شد کا جو مدعا سمجھے
وہ زندگی کو مرض، موت کو دوا سمجھے

جو آفرینشِ دنیا کو حادثہ سمجھے
وہ عقل، حُسن، محبت کے راز کیا سمجھے

یہ عام طور سے دیکھا گیا کہ ارماں کا
اُسی نے خون کیا جسکو باوفا سمجھے

کسی غریب کے گھر کا چراغ دنیا میں
کبھی جلا ہو تو کوئی بجھا ہوا سمجھے

یہ ایک نقطۂ تفریق نے ستم ڈھایا
ہوئے خدا سے جُدا خود کو کیا سے کیا سمجھے

تلاشِ حق کا وسیلہ بھی اور ذریعہ نجات
وہ دردِ دل کی اذیت جسے بُرا سمجھے

یہ حدِ جور و جفا ہے یہ شانِ خود غرضی
ستم شعار محبت کو بھی خطا سمجھے

متاعِ صبحِ ازل تھی مآلِ شامِ ابد
وہ زندگی جسے دو دن کا ماجرا سمجھے

طلوعِ صبحِ قیامت پہ ہی نظر اُٹھی
جو اُس کے وعدۂ فردا کا مدعا سمجھے

کہیں پہ پھولوں نے روکا کہیں پہ کانٹوں نے
وہ راستہ ہی نہ تھا جسکو راستہ سمجھے

پہاڑ دشت ہوں سمندر بھی اور ساحل
جو اپنے عزم کو انسان رہنما سمجھے

شدتِ ستم کی حد ستم سے نکل گئی
وہ غم بڑھا کہ چہروں کی رنگت بدل گئی

سب کہہ رہے ہیں شاخِ نشیمن کی جل گئی
میں کیا کہوں کہ میری تو دُنیا بدل گئی

حرص و ہوا و آز کا عالم نہ پوچھئے
جب بھی بہار آئی طبیعت مچل گئی

جب شام خیریت سے گذر جائے تب کہوں
حسرت نصیب دل کی بلا آج ٹل گئی

گلشن میں رنگ و بو ہے نہ محفل میں سوز و ساز
وہ انقلاب آیا کہ دُنیا بدل گئی

محنت کشانِ دہر کا عالم وہی رہا
دن مائلِ زوال ہوا دھوپ ڈھل گئی

کتنا بڑا آل شبِ غم کا ماجرا
جو بات دل میں تھی وہ زباں سے نکل گئی

برقِ ستم سے لاکھ بچایا کئے مگر
جو جلنے والی چیز تھی آخر وہ جل گئی

جب کچھ سکت رہی نہ دلِ بیقرار میں
موت آئی اور زیست کا نقشا بدل گئی

آخر کو رنگ لائی مری لغزشِ قدم
راہوں کے ہیر پھیر میں منزل بدل گئی

بجلی سے آشیانہ بچا تھا کہ ناگہاں
بسملؔ ہوائے تند گلستاں میں چل گئی

حدِ جنوں میں حدِ غمِ زندگی نہ تھی — نیرنگیٔ خیال کی دُنیا نئی نہ تھی

بُنیادِ فصلِ گل کی چمن میں پڑی نہ تھی — جب تک کسی کی جانِ حزیں پر بنی نہ تھی

کیونکر کہوں کہ رنج کی حامل خوشی نہ تھی — اس زندگی سے پہلے کوئی زندگی نہ تھی

یا میری جستجو کو سہارا نہیں ملا — یا محشرِ خیال کی دُنیا نئی نہ تھی

میں خود رہینِ حرصِ ستم ساز ہو گیا — دُنیا کو ورنہ مجھ سے کوئی دشمنی نہ تھی

پھر کس کی تیرگی ہے شبِ غم میں ہی اگر — اے کاوشِ خیال تری روشنی نہ تھی

مانا کہ مجھکو تنگیٔ داماں کا تھا گلا — اے دینے والے تیرے یہاں تو کمی نہ تھی

بیکار گرم و سردِ جہاں کا اثر لیا — دم بھر کی زیست لائقِ رنج و خوشی نہ تھی

ہنگامۂ سحر میں نہاں تھا مآل سب — کہنے کو روشنی تھی مگر روشنی نہ تھی

یا رب وقارِ شیشہ و ساغر کی خیر ہو — اُس کو پلائی جاتی ہے جسنے کہ پی نہ تھی

بسمل نگاہ چاہیئے دیدار کے لئے
فصلِ خزاں میں آتشِ گل کی کمی نہ تھی

دل کو حاصل کبھی خوشی نہ ہوئی
زندگی میری زندگی نہ ہوئی

حُسن انصاف سے شکایت کیا
جب محبت ہی مُدّعی نہ ہوئی

میں تو اُس کی عطا کا قائل ہوں
جس کے غم میں کبھی کمی نہ ہوئی

دیکھتے ہم مآلِ بزمِ نشاط
خیر سے اتنی زندگی نہ ہوئی

حد سے آگے نہ بڑھ گئی جب تک
دوستی وجہِ دُشمنی نہ ہوئی

کیا کہیں اُس حیاتِ فانی کو
جو کسی کے بھی کام کی نہ ہوئی

کیسی منزل ہے اور کیسی تلاش
ختم اب تک جو رہروی نہ ہوئی

عیش و عشرت کی بات کیا کہیے
جب مصیبت بھی دائمی نہ ہوئی

غمِ دُنیا کو بھی یہ حسرت ہے
اور دو دن کی زندگی نہ ہوئی

عظمتِ رفتہ پوچھنے والو
آج اس گھر میں روشنی نہ ہوئی

بے قراری سے جب نجات ملی
دلِ بسمل کی زندگی نہ ہوئی

جو مطلب ایک ہے تو بحث اندازِ بیاں کیسی
ہماری داستاں کیسی تمہاری داستاں کیسی

یہ قبل از وقت گلشن میں چلی بادِ خزاں کیسی
ہوئیں اور ناگوارِ دل ہوئیں تبدیلیاں کیسی

حریصِ حسرتِ تعمیرِ نو پر کاش ظاہر ہوں
نہیں عالمِ برباد میں آبادیاں کیسی

خدارا پوچھئے اُڑتے ہوئے رنگِ گلستاں سے
کہ ہوتی ہے بہارِ زندگانی کی خزاں کیسی

اگر ہم مان لیں اس زندگی کی کچھ حقیقت ہے
تو پھر کہنا پڑیگا دل کی یہ بےچینیاں کیسی

غرورِ کاسۂ سر رنگ لائے گا پسِ مُردن
سرِ راہِ عدم کچھ بھی نہ ہوگا ہڈیاں کیسی

صمیمِ قلب سے نکلی دُعائیں کام کرتی ہیں
جو قاصر ہو بیانِ حالِ دل سے وہ زباں کیسی

محبت کیا ہے یوں سمجھو کہ اک اسکے نہ ہو جیسے
دلوں میں کیسا فرق آیا ہوئیں بربادیاں کیسی

جو تو آئینہ بردارِ جمالِ نظم ہے بسمل
تو اکثر قافیوں میں یہ ادائے شائیگاں کیسی

ازل کا دن قیامت ڈھا رہا ہے
خیالِ رنجِ دُنیا آ رہا ہے

یہ کیا جو نعمتیں ٹھکرا رہا ہے
ترے در سے وہ سب کچھ پا رہا ہے

ارے قصد بیان رنج دم لے — کلیجہ ہے کہ منہ کو آ رہا ہے
خیالِ عیش کیسا زندگی کیا — وطن جب ہم سے چھوٹا جا رہا ہے
غنیمت ہے اگر ناکامیوں میں — دلِ ناکام کچھ کام آ رہا ہے
ارے ذوقِ نظر بیدار ہو جا — اُجالا پھر فلک پر چھا رہا ہے
تباہی آج یہ پرساں ہے مجھ سے — نشیمن کیا ترے کام آ رہا ہے

سہارا ڈوبنے والے کو دے کر
سفینہ خود بھی ڈوبا جا رہا ہے

وقت ہی گوشت کو ناخن سے جدا کرتا ہے — وقت ہی خوگرِ تسلیم و رضا کرتا ہے
ہم سے بہتر ہے سرِ بزمِ محبت وہ چراغ — دوسروں کیلئے شب بھر جو جلا کرتا ہے
صبر کو اُس کے نہ چھیڑو جو وفورِ غم سے — خون کے گھونٹ مزے لیکے پیا کرتا ہے
مال و زر بخششِ روزانۂ خالق ہیں مگر — غم کی نعمت بھی سمجھکر وہ عطا کرتا ہے
موسمِ گل کے لوازم میں ہیں برق و باراں — آشیاں روز بنا اور جلا کرتا ہے

بے خبر ہو کے نہ چل رہروِ راہِ دُنیا — ذرّہ بھی باعثِ اُفتاد ہوا کرتا ہے
ایک وہ حرف جسے رشتۂ اُلفت کہئے — ایک وہ نقطہ خدا سے جو جدا کرتا ہے
سرزنش کرتی ہے الطاف و کرم کی بارش — جب خطاکار خطاؤں پہ خطا کرتا ہے

اپنے مسلک سے نہ ہٹ راہِ وفا میں سنبھل
دوست کہتا ہے بُرا تجکو بھلا کرتا ہے

حسن کو دل کا مدّعا کہیئے — ابتدا ہی کو انتہا کہیئے
درد کو دوست کی عطا کہیئے — ہر نفس پر خدا خدا کہیئے
کیوں کبھی کم کبھی سوا کہیئے — درد کو صبر آزما کہیئے
بہرِ تسکینِ خاطرِ ناشاد — درد کو درد کی دوا کہیئے
اس مساواتِ زندگانی میں — کس کو بندہ کسے خدا کہیئے
جس کے دم سے ہے زندگی کی بہار — اس حقیقت کو مرحلہ کہیئے
لذّتِ غم سے جو نہیں واقف — اُن سے کیوں دل کا ماجرا کہیئے

گر نہ کہیے سرابِ دشتِ بلا — رنگِ دنیا کو اور کیا کہیے

عبد و معبود کے توسل کا — عجز کو ایک واسطہ کہیے

حسن اور عشق کی کشاکش کو — دو دلوں کا معاملہ کہیے

اپنے دل کو ٹٹولیے پہلے — پھر کسی کو برا بھلا کہیے

اس سوال و جواب کے صدقے — کوئی کیا پوچھے آپ کیا کہیے

کیا یہی ہے جوابِ عرضِ حال — کبھی شکوہ کبھی گلا کہیے

ٹوٹنے والے ربطِ دنیا کو — کیوں محبت کا آسرا کہیے

انقلاباتِ زندگانی سے — جو ملے اس کو حادثہ کہیے

رازدارِ حیاتِ فانی کو — سازگارِ رہِ بقا کہیے

آج وہ دردِ لاحقِ دل ہے — ہر مرض کی جسے دوا کہیے

جس کا کوئی شریکِ حال نہ ہو — اس مصیبت کو حق نما کہیے

بزمِ امکاں میں کس لیے بسمل
اپنی تقدیر کو برا کہیے

کون سی لفظوں میں ذکرِ رنگِ دنیا کیجئے ‏ ‏ ‏ کس زبان سے شکوۂ اور اپنوں کا شکوا کیجئے
اُس کی صورت کا تصوّر اک فریبِ آگیں نشاط ‏ ‏ ‏ جس کے ہر جلوے کو جی چاہے کہ دیکھا کیجئے
اُس حقیقت کو جو ہے اب تک حجاب اندر حجاب ‏ ‏ ‏ جلوہ گاہِ ناز میں تا عمر ڈھونڈھا کیجئے
کارفرمائے محبت جب ہے آوازِ ضمیر ‏ ‏ ‏ پھر تو میری رائے میں دل ہی کا کہنا کیجئے
حسنِ قدرت کے کرشموں پر قیاس آرائیاں ‏ ‏ ‏ اس سمجھنے سے تو بہتر ہے نہ سمجھا کیجئے
زندگی آتش بہ داماں بیکسی دامن کشاں ‏ ‏ ‏ جائیے کیونکر کہیں اور جا کے بھی کیا کیجئے
منتشر ذرّے منظم ہو بھی سکتے ہیں مگر ‏ ‏ ‏ زندگی برباد ہو جائے تو پھر کیا کیجئے

ایک ہی مسلک کے ہیں بسمل طریقِ کار دو
روئیے محفل میں یا شعلوں سے کھیلا کیجئے

چراغِ زندگی میرا بجھا کے ‏ ‏ ‏ پریشاں پھرتے ہیں جھونکے ہوا کے
ندامت سے مری تربت پہ آ کے ‏ ‏ ‏ بہت رویا ستمگر سر جھکا کے
وفا کا وہ نہیں مطلب نہ سمجھے ‏ ‏ ‏ سمجھتے ہیں فقط معنی جفا کے

اب اُن سے کون پوچھے کون کہا کیوں
مٹانا تھا اگر مجھ کو بنا کے

ہوئی بحرِ فنا میں غرق آخر
بچی سو بار کشتی ڈگمگا کے

جہاں میں اس چند روزہ زندگی کو
بہت نادم ہوا میں آزما کے

اُسے کیوں ابتدائے درد سمجھیں
مزے آتے ہیں جس میں انتہا کے

وہی تو آتشِ ہجراں ہے بسمل
کوئی پُرساں نہ ہو جس کو لگا کے

گرمیٔ وحشت یہ عالم ہے تری تاثیر کا
حلقہ حلقہ جل رہا ہے پاؤں کی زنجیر کا

پوچھنا کیا حال ایسے عالمِ تاثیر کا
حکم رکھتی ہے جہاں کی خاک بھی اکسیر کا

کیا بتائیں کیا ہوا انجام اک نخچیر کا
کوششیں کیں لاکھ لیکن رُخ نہ بدلا تیر کا

بجلیاں گرتی ہیں جتنی آشیانے پر مرے
حوصلہ بڑھتا ہے اُتنا حسرتِ تعمیر کا

سادہ کاغذ بھیجنا اُس کا ہے شوخی کی دلیل
یہ جواب صاف ہے گویا مری تحریر کا

جوشِ غم۔ فرطِ خوشی۔ صبحِ ازل۔ شامِ ابد
حق تو یہ ہے سلسلہ ہے ایک ہی زنجیر کا

اپنے اعمالوں کا ضامن خود ہی میں ہوں اسلئے
جانتا ہوں جو بھی لکھا ہے مری تقدیر کا

موت بہتر ہے کہ میری زندگی کیونکر کہوں
ایک ہی رُخ ہے نظر کے سامنے تصویر کا

شمعِ محفل بجھ گئی رخصت ہوا سنبل شباب
عہدِ پیری ہے زمانہ خواب کی تعبیر کا

احساسِ بے زری سے مرے لب پہ آہ ہو
بے مائیگی میں دولتِ دل کیوں تباہ ہو

وہ بھی ہر کوئی کوہ جو مانندِ کاہ ہو
طوفانِ برق و باد کے ہاتھوں تباہ ہو

تابِ جمالِ یار وہ کیا لا سکے گی خاک
تاریکیوں میں گُم جو ہماری نگاہ ہو

کیونکر چھپائے رنگ زمانے کا وہ گناہ
ہر ذرہ کائنات کا جس کا گواہ ہو

قسمت ہی میں لکھا تھا تڑپے مدوجزر بحر
ساحل قریب آئے تو کشتی تباہ ہو

ایوانِ سلطنت کی ہوس ہے اگر تو پھر
درویش کے لئے بھی کوئی خانقاہ ہو

لائیگی رنگ حالتِ دنیائے ضبط و صبر
سو آشیاں بنیں گے اگر اک تباہ ہو

کچھ تو ہے جسکی وجہ سے قدرت ہو دست کش
منظور ہی خدا کو خدائی تباہ ہو

سوزِ غمِ فراق کو ہے ضبطِ دل سے کام
جل جاؤں میں زباں پہ اگر لفظ آہ ہو

وہ روشنی ہی کیا کہ پسِ پردہ ہو تو خیر
آنکھوں کے سامنے ہو تو بارِ نگاہ ہو

طرزِ بیانِ بسملِ غمگیں میں وہ کہاں
مقصود شاعری کا اگر واہ واہ ہو

باغ کی رُت بدل گئی پھولوں پہ رنگ بار ہے
کیفِ بہارِ زندگی اُترا ہوا خمار ہے

رازِ حقیقتِ جہاں چہروں سے آشکار ہے
جب سے ملی ہے زندگی موت کا انتظار ہے

دستِ سوال سے گریز حسنِ طلب سے عار ہے
حالِ دلِ غریب کا درد ہی رازدار ہے

گلشنِ حسن و عشق میں سب کا جگر فگار ہے
میں ہی ستم زدہ نہیں لالہ بھی داغدار ہے

گردشِ بختِ نارسا بیخودیِ حسنِ یار ہے
فیضِ خزاں سے پائے کیا جسکو غمِ بہار ہے

نظمِ حیات دیکھیے غم پہ خوشی نثار ہے
بزم کی جان ہو وہی شمع جو اشکبار ہے

صبحِ ازل کے بھیس میں حسنِ کرم شعار ہے
رازِ درونِ پردہ بھی پردے سے آشکار ہے

آب و ہوا کے پیچ میں آتشِ ہجرِ یار ہے
روزِ ازل سے خاکِ دل مائلِ انتشار ہے

اتنا ہی دور قربِ حق بسملِ دلفگار ہے
جتنا کہ تجکو دہر میں اپنے پہ اعتبار ہے

محبت ہی سے ربطِ جسم و جاں ہے
یہ رشتہ حاصلِ کون و مکاں ہے

گذشتہ شان و شوکت اب کہاں ہے
فلاکت یادگارِ رفتگاں ہے

تباہی سے رہے محفوظ کیونکر
کہ تنکوں پر بنائے آشیاں ہے

حریصِ لذتِ آزار بن کر
جسے دیکھو بہ چشمِ خونفشاں ہے

سفینہ عمر کا بحرِ فنا میں
غنیمت جانئے جبتک رواں ہے

خدا جانے بنے کتنے وہاں پر
جہاں کہنے کو میرا آشیاں ہے

چلا جاتا ہوں ہمراہِ زمانہ
خدا جانے مری منزل کہاں ہے

نظامِ گردشِ قسمت میں بسمل
کسی کو کب مجالِ این و آں ہے

یہ جان کر بھی کہ سائل کی آبرو کیا ہے
زہے نصیب وہ گر پوچھ لیں کہ تو کیا ہے

چمن میں اپنے نشیمن پہ گر چمکی بجلی
اب اور حاصلِ دُنیائے رنگ و بو کیا ہے

خروشِ راہ محبت کی بے نشاں منزل
بتا رہی ہے مجھے میری جستجو کیا ہے

کچھ ایسے مستِ مئے بیخودی ہیں دُنیا میں
خبر یہ جن کو نہیں جام کیا سبُو کیا ہے

رہینِ بخیہ گری ہو بھی جائے چاکِ جنوں
بھریں نہ زخم جگر جس سے وہ رفو کیا ہے

کسی کا جلوۂ رنگیں ہے اِک فریب نظر
اگر نہیں تو پھر آنکھوں کے روبرو کیا ہے

طوافِ دہر کیا بن کے سائلِ اُلفت
کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ آرزو کیا ہے

تلاشِ کوثر و تسنیم کے سوا بسمل
تری نماز ہی کیا ہے ترا وضو کیا ہے

رُلائے خون کے آنسو ہنسی نے
مجھے بے موت مارا زندگی نے

بڑھا دی اک نقاب اور اُسکے رُخ پر
مرے جذبِ محبت کی کمی نے

مثال اپنی جو خود ہی تھا جہاں میں
اُسے بندہ بنایا بندگی نے

نہ آتے جو کبھی وہم و گماں میں — کیے وہ راز افشا مفلسی نے
حقیقت میں جہانِ زندگی کے — چلائے کام ربطِ باہمی نے
نظامِ عالمِ قدرت نہ بدلا — مری دنیا بدل دی بیکسی نے
بتاؤ اب ہو کس عالم میں بسمل
نہ پوچھا بھول کر بھی یہ کسی نے

جانا چاہوں تو کہیں چھوڑ کے جانے نہ بنے — سر کسی در پہ سوا تیرے جھکائے نہ بنے
میں وہ مجبورِ محبت ہوں کہ ہنگامِ کلام — حال چاہوں کہ بتاؤں تو بتائے نہ بنے
اس طرح ہوتی ہے بزمِ شبِ عشرت کی سحر — رنگ اکھڑی ہوئی محفل کا جمائے نہ بنے
اب تمنا ہے تو اس بات کی اے چشمکِ برق — آگ ایسی تو لگے جس کو بجھائے نہ بنے
طالبِ دہر مبارک ہو تجھے جامِ جمشید — میرے کس کام کا جب منھ سے لگائے نہ بنے
زندگی جادۂ تسلیم و رضا ہو جائے — داغِ غم کا نقش کہ اب اس کو مٹائے نہ بنے
جان دینے کے سوا چارہ ہی کیا ہے بسمل — زیست کا بار جو کاندھوں سے اٹھائے نہ بنے

اُف دلِ بے قرار کھو بیٹھے — رازداں، رازدار کھو بیٹھے

اپنی آنکھوں کی روشنی آخر — ہم شبِ انتظار کھو بیٹھے

آشیانہ بنا کے گلشن میں — لطفِ باغ و بہار کھو بیٹھے

پرتوِ حسنِ یار تیری قسم — دل کو بے اختیار کھو بیٹھے

مختصر یہ ہے داستانِ غم — اہلِ دل جانِ زار کھو بیٹھے

دیدِ جاناں کی آرزو کر کے — ہاتھ سے کوئے یار کھو بیٹھے

آئے کیوں بزمِ ناز میں بسمل
کیا سمجھ کر وقار کھو بیٹھے

خوانِ نعمت کو دیکھتا ہوں میں — اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں

جس نے ڈالی بنائے ناکامی — اُس محبت کو دیکھتا ہوں میں

آئینے کا وقار جاتا ہے — جب کدورت کو دیکھتا ہوں میں

خوگرِ رنج ہو گئی عادت — غم کی لذت کو دیکھتا ہوں میں

جس کی مد میں ہے روزِ محشر بھی
اُس مصیبت کو دیکھتا ہوں میں

پاس سب کچھ ہے کچھ نہ ہونے پر
اُس خدا کی رحمت کو دیکھتا ہوں میں

ملتی جلتی ہے میرے قصے سے
جس حکایت کو دیکھتا ہوں میں

طالبِ دید ہو گئے موسیٰؑ
اس جسارت کو دیکھتا ہوں میں

گردِ آشوبِ دہر میں پنہاں
نقشِ تربت کو دیکھتا ہوں میں

آئینہ میں جمالِ قدرت کے
اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں

جلوہ بے انتہا نظر محدود
اس ظرافت کو دیکھتا ہوں میں

عاجزی کے مقابلہ میں پست
کبر و نخوت کو دیکھتا ہوں میں

گردشِ چرخ اے معاذ اللہ
اپنی حالت کو دیکھتا ہوں میں

بے ثباتی پہ ہے بنا جس کی
اس عمارت کو دیکھتا ہوں میں

وجہ بربادیٔ دلِ بسمل
جوشِ اُلفت کو دیکھتا ہوں میں

کسی کے جود و کرم کا حساب کیا جانے
رموزِ بحرِ حقیقت حباب کیا جانے

وطن میں اہلِ وطن کو ملا جو کانٹوں پر
دلِ غریب وہ آرامِ خواب کیا جانے

بھلے بیت جہاں روشنی کا نام نہ ہو
وہ ظلمتِ شبِ غم آفتاب کیا جانے

نتیجہ لذتِ دُنیا کا تلخ کامی ہے
یہ بات تشنۂ جامِ شراب کیا جانے

رضا نے جس کی جہاں در جہاں کئے پیدا
حساب وہ کرمِ بے حساب کیا جانے

تپش نواز ہیں نیرنگیاں زمانے کی
سکونِ غم خلشِ اضطراب کیا جانے

چھپائے ہے اُسے دامن ہی میں ازل سے مگر
کہاں یہ برق گرے گی سحاب کیا جانے

ہزار بار کہوں گا کہ واقعہ ہے یہی
نہ پی ہو جس نے وہ لطفِ شراب کیا جانے

قدم رکھا ہے جہاں آج ضعفِ پیری نے
وہ جوشِ مستیٔ عہدِ شباب کیا جانے

تغیّرات سے ہے صرف واسطہ اُس کو
ہے زد پہ کون اسے انقلاب کیا جانے

زمانہ چین سے رہنے نہ دے جسے بسملؔ
سکون وہ دلِ خانہ خراب کیا جانے

یہی نہیں کہ بجھیں گے مرے مکاں کے چراغ
سحر کے ہوتے ہی بجھ جائینگے جہاں کے چراغ

زبانِ حال سے کہتی ہے قبرِ کشتۂ ناز
کہاں کے پھول کہاں کا چمن کہاں کے چراغ

نمو کا جوش بڑھا اعتدال سے آگے
فروغِ آتشِ گل سے جلے خزاں کے چراغ

خبر نہ تھی کہ چلے گی ہوائے تند ایسی
چمن میں آگ لگا دینگے آشیاں کے چراغ

کیا تھا گردشِ دنیا نے اس قدر خائف
صدف کی تہہ میں چھپے بحرِ بیکراں کے چراغ

سمجھ میں حسن وہ آئے تو کس طرح آئے
جلائے جسکی تجلی نے دو جہاں کے چراغ

مسافرِ رہِ الفت نے سانس ٹھہر کے لی
پلک جھپکتے ہی وہ جھل تھے کارواں کے چراغ

سلوک دل سے کیا یہ کسی کی نظروں نے
جگر میں جلنے لگے تیرِ بے کماں کے چراغ

ہماری آہِ رسا کو گمان ہے ابتک
یہ آسمان پہ تارے ہیں یا فغاں کے چراغ

خموشیاں تھیں کہ آوازِ لفظِ کن آئی
حیات ملتے ہی جلنے لگے زباں کے چراغ

حرارتِ غمِ دل حد سے بڑھ گئی آخر
جلائے سوزِ محبت نے استخواں کے چراغ

تاثیر یہ ہے گردشِ لیل و نہار کی
امید ٹوٹتی نہیں امیدوار کی

وہ بھی ادا ہے جلوۂ رنگین یار کی
کہتے ہیں جسکو لوگ ادا سی مزار کی

منزل کی سمت بڑھتا چلا جا رہا ہوں میں
کم ہوتی جا رہی ہیں حدیں اختیار کی

گلشن سے پھول خار بیاباں کے چاہیئے
تصویر کھینچنا ہے طلسمِ بہار کی

ناسازیٔ مزاج سے بدلا چمن کا رنگ
ہے کیفیتوں نے بڑھکے فضا سازگار کی

امکانِ حادثات نہ تھا وہ تو کون تھا
ساحل سے جسنے کشتیٔ دل ہمکنار کی

آنکھوں میں بزمِ یار کی تصویر کھینچ لی
نظریں بتا رہی ہیں کسی ہوشیار کی

ہر شے میں ایک حسن ہے ہر چیز میں کشش
منزل کڑی ہے قلبِ عقیدت شعار کی

گردش فلک کی اپنی حدوں سے گذر گئی
راتیں کٹیں مگر نہ مرے انتظار کی

ہاں جسکی راہِ شوق میں سو دھجیاں ہوں
قیمت نہیں کچھ ایسے گریباں کے تار کی

بسمل نظامِ دہر میں تبدیلیاں ہوئیں
امید ٹوٹ ہی گئی امیدوار کی

جب کہیں کا بھی نہیں رکھا مجھے — چھوڑ کر راہی ہوئی دنیا مجھے
مقتضائے وقت تھا المختصر — جس نے بھی جس حال میں دیکھا مجھے
اسکو اپنی زندگی کیونکر کہوں — وقت پر دے جائے جو دھوکا مجھے
راز پوشیدہ رہا تعمیر کا — آج تک کوئی نہیں سمجھا مجھے
رنگِ رُخ گلزار کا بدلا ہوا — دے رہا ہے دعوتِ صحرا مجھے
جب چمک سی درد کی دل میں اُٹھی — یار کا جلوہ نظر آیا مجھے
ایسی ناکامی کے قرباں جایئے — کر دیا ہے جس نے کیا سے کیا مجھے
اپنے بیگانوں نے منہ موڑا مگر — وہ خدا تھا جو نہیں بھولا مجھے
زندۂ جاوید ہے میرا پیام — زندگی دے جائے گو دھوکا مجھے
اختیاراتِ محبت کی قسم — بے بسی نے کر دیا رسوا مجھے
ایسے طرزِ زندگی کو سو سلام — جو بنا دے غیر کا بندا مجھے
راہ کی نیرنگیاں حائل ہوئیں — سُوئے منزل دیکھ کر بڑھتا مجھے
دل دیا بسمل سمجھ کر بے قرار — دینے والا اور کیا دیتا مجھے

سوزِ اُلفت ہے سازگار ہنوز
شمعِ محفل ہے اشکبار ہنوز

دُور ہے یار کا دیار ہنوز
دوش پر زندگی ہے بار ہنوز

دھجیاں اُڑ چکیں گریبان کی
زینتِ باغ ہے بہار ہنوز

وعدہ کچھ اس طرح کیا اُسنے
کر رہے ہیں ہم انتظار ہنوز

جلوہ آشکار ہے شاید
پسِ پردہ ہے حُسنِ یار ہنوز

میں وہ ناکامِ مرگ ہوں جسکو
زندگی کا ہے اعتبار ہنوز

راہ رو اُن کو تو غنیمت جان
جو شجر بھی ہیں سایہ دار ہنوز

گردشیں تھم گئیں زمانے کی
دلِ بسمل ہے بے قرار ہنوز

شمع جلتی ہے تحمل نہیں پروانے کو
دامنِ صبر یہ محفل میں ہی آنچ آنے کو

روشنی سے نہیں تاریکیٔ دنیا خالی
کون سمجھائے شبِ ہجر کے دیوانے کو

خونِ دل خونِ جگر خونِ تمنا کے سوا
تھی غرض کسکو جو بھرتا مرے پیمانے کو

کیا بتائے وہ نہیں جس کے گریباں میں تار
کتنی مدت ہوئی گلستاں میں بہار آنے کو

یادِ گلشن کی جو غربت میں ستاتی ہے مجھے
دیکھ لیتا ہوں بہ حسرت کسی ویرانے کو

حق کی تو بات یہ ہے کہ قالبِ انساں میں نہیں
دل جو خالق نے عطا کر دیا پروانے کو

زندگی، کہتے ہیں پس ماندۂ راہِ اُلفت
منزلِ ہستیِ فانی سے گذر جانے کو

خوابِ راحت سے کھلی آنکھ گلستاں میں مگر
بجلیاں گھیر چکیں جب مرے کاشانے کو

دلِ برباد کے ذرّے ہی بہت ہیں بسمل
زندگانی کی حقیقت ہمیں سمجھانے کو

ہمارے دل کا اندازِ وفا کچھ
محبت کا حقیقی مدعا کچھ

خدا معلوم مجھ پر کیا گذرتی
ملا ہوتا جو دل کو آسرا کچھ

خموشی کے معانی، اللہ اللہ
کوئی کچھ سمجھا، کوئی کہہ گیا کچھ

عدم کے رازِ سربستہ کا عقدہ
کھلا لیکن کھلا بعدِ فنا کچھ

سمجھتے ہیں جو جزو و کل کا رشتہ
کہیں کیونکر خدا سے ہے جدا کچھ

پسِ مردن بھی خاکِ دل ہے باقی — تعجب کیا اگر ہو جائے کیا کچھ
نہ گھبرا اے دلِ بسمل نہ گھبرا
نہیں اب زندگی سے واسطہ کچھ

جان لیوا ہیں دلی افکار کیوں — دوش پر ہے زندگانی بار کیوں
کشمکش میں ہے جمالِ یار کیوں — یہ فریبِ کثرتِ انوار کیوں
جا رہا ہوں اپنی منزل کی طرف — پوچھتے ہو تیز ہے رفتار کیوں
جب محبت ہی دلوں سے اُٹھ گئی — حُسن کی یہ گرمئ بازار کیوں
جلوۂ حسنِ ازل تو ہی بتا — ہے زمانہ درپئے آزار کیوں
راستہ چلتا جو آنکھیں کھول کر — مرے دامن سے اُلجھتے خار کیوں
دیکھنے کو شمع کا انجامِ زیست — صبح تک زندہ رہے بیمار کیوں
ڈوبنے سے جب ملے دل کو نجات — غم کے دریا سے ہو بیڑا پار کیوں
بیوفا خود اپنے اعمالوں سے پوچھ — پھر گئی تجھ سے نگاہِ یار کیوں

عشق تو یہ ہے جس میں آزادی ہو قید — جل نہ جائیں وہ در و دیوار کیوں

جل رہا ہے خاک میں بسمل کا دل
بیخبر ہے حسن کی سرکار کیوں

زندگی آزمائی جاتی ہے — ذرے ذرے میں پائی جاتی ہے
شمع ہستی مری بجھانے کو — آگ دل میں لگائی جاتی ہے
میری دنیا کی بیکسی بڑھ کر — سارے عالم پہ چھائی جاتی ہے
جلوہ ہوتا ہے اتنا ہی ظاہر — جتنی صورت چھپائی جاتی ہے
ہے خلاصہ وہ دونوں عالم کا — دل میں جو بات پائی جاتی ہے
وہ گنہگار ہوں کہ عصیاں کی — سامنے شکل آئی جاتی ہے

جب فنا کو بھی ہے فنا بسمل
قبر پھر کیوں بنائی جاتی ہے

دشواریٔ رہ سے قطعِ نظر دل راہ روی پہ مائل ہے
منزل کا تصور ہے آسان منزل پہ پہونچنا مشکل ہے

اِن اونچی نیچی موجوں کا ادنیٰ سا کرشمہ یہ دیکھا
کل اور جگہ پہ ساحل تھا آج اور جگہ پہ ساحل ہے

بے وجہ کوئی بھی بات نہیں ہے سوز کوئی بھی ساز نہیں
یہ راز تو میں مشکل سے سمجھا ناکامی کا بھی حاصل ہے

گو لاکھ طرح سے سمجھایا تربت میں ملیگا چین مگر
دل پھر بھی مرا گھبراتا ہی کیا جانے کیسی منزل ہے

انسان کہ جسکے باعث سے تخلیق ہوئی اس دنیا کی
ناکام وہ کیوں ہے دنیا میں یہ بات سمجھنا مشکل ہے

تاروں پہ اداسی چھائی ہے اور شمع کے رُخ پر زردی بھی
اے سونیوالو اب جاگو کیا نیند تمہاری غافل ہے

فطرت کی سلیقہ مندی نے رکھا نہ تصرف کا موقع
وہ چیز وہیں پہ ہے زیبا جو چیز جہاں کے قابل ہے

آشوب حوادث کے پردے آنکھوں پہ پڑے ہیں کچھ ایسے
ہر آن تغیر ہوتا ہے اور دنیا پھر بھی غافل ہے

قسمت کی بنائی راہوں پر چلنے کیلئے چلتے ہیں مگر
اسکی بھی نہیں کچھ ہمکو خبر کس جا پہ ہماری منزل ہے

کچھ ایسی روش سے دنیا کی رفتار نے پلٹا کھایا ہے
اِک تم ہی نہیں بسمل بسمل اب سارا زمانہ بسمل ہے

مایوسیٔ نگاہ نہ ہو پردہ در کہیں
رنگینیوں کو ڈھونڈھ رہی ہے نظر کہیں

آئینہ دارِ راہِ حقیقت ہو کس طرح
جب زندگی کی شام کہیں ہو سحر کہیں

دیکھو ابھر ابھی نقشِ تصور میں جس نے رنگ
آنکھوں سے بہہ نہ جائے وہ خونِ جگر کہیں

کیوں کر بتاؤں منزلِ افتادِ زندگی
جب تک کہ ختم ہو نہ مری رہگذر کہیں

ہاں جن کے ارتباط سے محشر بپا ہوا
وہ خاک دل کہیں ہے وہ لطفِ نظر کہیں

جاں پر بنی ہوئی ہے فقط اس خیال سے
مایوس ہو نہ جائے مرا چارہ گر کہیں

صیاد کی جفاؤں سے اب کی بہار میں
میں خستہ جاں کہیں ہوں مرے بال و پر کہیں

لائی ہے رنگ جرم گنہ کی صلاحیت
جاتی ہے نہ طاقتِ صبرِ بشر کہیں

پہلو میں انقلاب کی دنیا لئے ہوئے
شمع خموشِ صبح جلی رات بھر کہیں

بڑھتی ہیں اور بھی دلِ بسمل کی الجھنیں
ملتا ہے زندگی کا سہارا اگر کہیں

اب خودی ہے نہ بیخودی میری
خواب سے آنکھ کھل گئی میری

جس پہ ہنستی ہے ہستیٔ موہوم
وہ تماشا ہے زندگی میری

جان دیدی سمجھ کے یہ میں نے — ہے اسی میں سلامتی میری
اپنے احساسِ زندگی کی قسم — کہیں اچھی تھی بے حسی میری
درسِ عبرت ہے راہ رو کے لئے — شمعِ تربت بجھی ہوئی میری
اس کو جورِ فلک نے لوٹ لیا — زندگی تھی جو واقعی میری
پرتوِ حسنِ لازوال ہوں میں — دائمی ہے یہ روشنی میری
رازدارِ طلسمِ وحدت ہوں — اِک معمہ ہے بندگی میری
چار دن کی رہی اس چمن کی بہار — دو ہی دن کی ہے زندگی میری

چمن بہار پہ شہرہ تھا آشیانے کا — مگر یہ ذکر ہے گذرے ہوئے زمانے کا
زبانِ خلق پہ شکوہ ہے دانے دانے کا — رہے گا یاد زمانہ یہ غم کے کھانے کا
بُری بلا ہے جو بدلا ہے رُخ زمانے کا — ازل کے دن سے ہوں عادی فریب کھانے کا
ہر انقلاب کے ہمراہ دوسری دُنیا — ہر اختتام ہے آغاز اک فسانے کا
جہاں میں خس و خاشاک ہو گئے کمیاب — خیال جب سے ہوا آشیاں بنانے کا

چمن سے دامنِ گلچیں میں ٹوٹ کر آئے
نتیجہ مل گیا غنچوں کو مسکرانے کا

بتائیں کیا تمہیں اسباب، تحوت میں جن کے
بجھا چراغ ہمارے غریب خانے کا

بدل رہا تھا کچھ اس طرح کروٹیں دریا
خیال ہوتا تھا کشتی کے ڈوب جانے کا

مقامِ عارضی تھا چمن، تو پھر اس میں
ہوا خیال ہی کیوں آشیاں بنانے کا

بہارِ باغ بھی آئی تو کس طرح بسمل
نشان تک نہیں ملتا ہے آشیانے کا

اثر حسن کا محفل کی ہر چیز پر ہے
مری زندگی وہ چراغِ سحر ہے

بظاہر ہمارا قصورِ نظر ہے
سمجھتے ہیں پردہ رُخِ یار پر ہے

میری زندگانی مری راہبر ہے
حوادث بتاتے ہیں منزل کدھر ہے

زمانے کی نیرنگیوں کا اثر ہے
جسے دیکھتا ہوں نئی راہ پر ہے

پسِ پردہ کچھ بھی حقیقت اگر ہے
تو کیونکر کہوں سب فریبِ نظر ہے

ٹھہر جا سرِ شامِ اے دل ٹھہر جا
تڑپنے کو باقی ابھی رات بھر ہے
رہائی یہ بھی ہی تباہی کا امکاں
اسیرِ قفس مُشتِ بے بال و پَر ہے

ہم نفس تعبیر جس کی دہر میں نایاب ہے
وائے ناکامی کہ اپنی زندگی وہ خواب ہے
زندگی بے کیف چشمِ آرزو پُر آب ہے
سچ ہے دُنیائے حوادث عالمِ اسباب ہے
ہو گئے آنسو بھی خشک اے سوزشِ پنہانِ غم
آگ سینے میں لگی ہی اور قحطِ آب ہے
زینتِ بزمِ ستم ہی خانہ ویرانی مری
لوگ کیوں کہتے ہیں دُنیا عالمِ اسباب ہے
المدد جوشِ جنون و المدد شوقِ نشاط
ڈوبنے جاؤں کہاں جب بحرِ غم پایاب ہے
باغ پر چھائی ہوئی ہیں عارضی رنگینیاں
جس کو نظریں ڈھونڈھتی ہیں حُسن وہ نایاب ہے
کر دیا ظاہر جہاں پر واقعاتِ طُور نے
دیدِ جاناں کی ہوس ستمل خیالِ خواب ہے

خبر کیا چارہ گر آئے نہ آئے
قضا بھی وقت پر آئے نہ آئے

شبِ غم کی سحر آئے نہ آئے
ستارہ اوج پر آئے نہ آئے

ہے دل کو حسرتِ دیدارِ جاناں
ان آنکھوں سے نظر آئے نہ آئے

گریگی زندگی قطعِ منازل
زمانہ راہ پر آئے نہ آئے

گرفتارِ بلائے شامِ غم ہیں
نظر نورِ سحر آئے نہ آئے

ہماری زندگی میں روزِ محشر
کسی کو کیا خبر آئے نہ آئے

شریکِ حالِ بسملؔ ہے وہ ہمدم
نظر خونِ جگر آئے نہ آئے

دنیائے محبت کی خلقت ہے جداگانہ
ذرّوں سے مرے دل کے آباد ہے ویرانہ

تجھ سے ترے بسمل کی فریاد ہے رندانہ
یہ دستِ کشی کیسی ہائے فیضِ کریمانہ

ارمانِ دلی بنکر پیوست رگِ جاں ہیں
ہستی کے مدارج میں آثار قدیمانہ

کس کو وہ تسلی دے کس کی کرے دلجوئی
جب شمع پہ گرتا ہو پروانے پہ پروانہ

دیکھی ہے ان آنکھوں سے آبادی و بربادی
کل جس کا لقب دل تھا اب نام ہے ویرانہ

جو وقت پہ مل جائے ساقی وہ غنیمت ہے
چلو کو سمجھتا ہوں رستا ہوا پیمانہ
تدبیر نے کوشش کی سنبھلا نہ مگر بسمل
تقدیر کے ہاتھوں سے چھوٹا ہوا پیمانہ

بن کے بہارِ زندگی صحنِ چمن پہ چھائے کیوں
برق کی زد میں آشیاں اپنا کوئی بنائے کیوں

مدتِ روشنیٔ دل تا بہ سحر اگر نہیں
بجھنے کو بزمِ عیش میں شمع کوئی جلائے کیوں

سینے میں دل ہے دل میں غم غم ہی مآلِ زندگی
مرکزِ حسن کی ہمیں راہ کوئی بتائے کیوں

بیٹھے بٹھائے کس لئے مفت کا رنج مول لے
وقت برا جب آپڑے اپنوں کو آزمائے کیوں

زحمتِ جورِ ناروا رکھے کسی پہ کیوں روا
مٹنے کو خود ہے جو بنا دوسروں کو مٹائے کیوں

جس کا وجود ہی نہیں منزلِ بے ثبات میں
اسکی تلاش کیوں کرے اسکا نشان پائے کیوں

جب نہیں اس جہان میں زیست کا اعتبار کچھ
بسملِ خستہ جاں کو پھر آس کوئی لگائے کیوں

زندگی دو گام چل کر رہ گئی — دل کی حسرت ہاتھ مل کر رہ گئی

جس پہ قائم تھا نظامِ زندگی — وہ ہوائے دل بدل کر رہ گئی

میرے ماتھے کی عرق ریزی کے ساتھ — دوپہر کی دھوپ ڈھل کر رہ گئی

کر ہی کیا سکتی تھی یادِ رفتگاں — دل کو چٹکی سے مسل کر رہ گئی

وجہِ ایجادِ قفس تھی فصلِ گل — یہ ہوا دو روز چل کر رہ گئی

ایسے مد و جزر سے کیا فائدہ — موجِ دریا کی اُچھل کر رہ گئی

جوشِ ناکامی کا عالم دیکھئے — مرے حصّے کی اُمل کر رہ گئی

انقلاب آیا مگر ابلاکِ غم — گرتے گرتے پھر سنبھل کر رہ گئی

ناوکِ غم نے کیا بسمل مجھے
ناگہانی موت ٹل کر رہ گئی

جس کو نظر سے دیکھ نہ پائے — اس کے لئے کیوں جان گنوائے

بات پتے کی کون بتائے — صاف کہے تو سولی پائے

یوں ہی لکھا تھا ہم کو مٹائے — خود بھی زمانہ چین نہ پائے
فصلِ گل بھی آنکھ دکھائے — دورِ خزاں بھی راس نہ آئے
رنگِ تضادِ عالمِ امکاں — گاہ ہنسائے گاہ رلائے
جسم و جاں کا نازک رشتہ — غم کے ہاتھوں ٹوٹ نہ جائے
جوشِ جنوں میں ہوش کی باتیں — کون سُنے اور کون سُنائے
رحم طلب ہے اُس کا تخیّل — خواب میں بھی جو چین نہ پائے
ہے یہ غنیمت گر سرِ منزل — صبح کا بھولا شام کو آئے
ارض و سما کا اُف رے تعلق — میرا نشیمن برق جلائے
بات سمجھ سے جب ہو باہر — دل کی صدا پر کان لگائے
حُسن فقط ہے دید کے قابل — ہاتھ لگائے تو پچھتائے
نظمِ جہاں ہے برقی رو پر — کس کی ہمّت ہاتھ لگائے
کیف و اثر میں ڈوبا نغمہ — ساز کو چھیڑے دل برمائے
برق کے ڈر سے جان تو چھوٹے — کاش نشیمن جل ہی جائے

جوشِ نمو سے فصلِ گل میں
پھول کھلے اور رنگ لائے
دیر و حرم کے پھیر میں بسملؔ
ڈر ہے خدا کو بھول نہ جائے

اک روز تو دل پر کوئی افتاد نہ آئے
اے حسرتِ ناکام تری یاد نہ آئے
اُس سمت بھی لائی ہے مجھے میری تمنا
جس سمت کوئی طالبِ امداد نہ آئے
تعمیر کی حسرت ہی یہ ہے خانۂ دل میں
تخریب کا عالم جو ہمیں یاد نہ آئے
لِلّٰلہ بتا دے ہمیں اے رنگِ زمانہ
کب تک لبِ خاموش پہ فریاد نہ آئے!
ارمانوں کا خوں جس نے کیا تیشۂ غم سے
اے جوشِ وفا اسکی ہمیں یاد نہ آئے
گُل آئیں، طیور آئیں تو پھر اے دلِ ناداں
کیوں دام بکف باغ میں صیاد نہ آئے
دُنیا نے کسی قوم کی حالت نہیں بدلی
جبتک کہ اُسے دار و رسَن یاد نہ آئے
کچھ اور نظر آئے فضائے چمن زار
گلشن میں اگر بادِ دلِ ناشاد نہ آئے
پہونچے گی اُسے ہر غم دُنیا سے اذیت
جبتک دلِ بسملؔ کو خدا یاد نہ آئے

منزلِ شوق خیالِ غلط انداز میں ہے
طائرِ فکر ابھی عالمِ پرواز میں ہے

کیف نغمہ میں ہے نہ تاثیر دمِ ساز میں ہے
زیست کا راز نہاں دور کی آواز میں ہے

کوئی وارفتۂ اندازِ وفا کیوں ہو کہ جب
ناوکِ ناز بھی دستِ قدر انداز میں ہے

کون جانے کہ کھلے سترِ حقیقت کب تک
کتنا اطناب نہاں فقرۂ ایجاز میں ہے

ایک وہ رنج جسے بعدِ مسرت کہیے
ایک وہ کیف جو یادِ غمِ جانباز میں ہے

آج کے دور کا یہ رنگ زمانہ اے دوست
سچ بتا دے ترے کس ناز کس انداز میں ہے

ہو کے پابندِ حوادث رہِ غم میں بسمل
کیا سمجھ پائے کہ کیا جلوہ گہِ ناز میں ہے

مبتدا کا ہے یہ رنگ اپنی خبر سے پہلے
جیسے پھول آتے ہیں شاخوں میں ثمر سے پہلے

ختم ہونے کو تو ہوتی ہے شبِ غم لیکن
خونِ دل تھوکنا پڑتا ہے سحر سے پہلے

آرزوئیں تھیں نہ احساسِ محبت دل میں
زیست بے کیف تھی آزارِ جگر سے پہلے

طے ہوئیں ایک نگاہِ غلط انداز کے ساتھ
منزلیں جتنی پڑیں حدِّ نظر سے پہلے

شکر صد شکر کہ پہونچے بہ مصیبت لیکن
کوئی در اور نہ دیکھا ترے در سے پہلے

دام کتنے ہیں، خطر کتنے ہیں، زنداں کتنے
کاش معلوم ہوں راہی کو سفر سے پہلے

خار و گل کیسے، بہارِ رُخِ سبزہ کیسی
کچھ بھی گلشن میں تھا جذب وِ اثر سے پہلے

حال کیوں پوچھئے اُس بزمِ ادا کا جسکی
شمع گل ہوتی ہے آغازِ سحر سے پہلے

اللہ اللہ یہ نیرنگیٔ دارِ فانی
خیر کا دور نہ آیا کبھی شر سے پہلے

شوقِ دیدار اگر ہے تو پھر اے بسمل زار
دل کی طاقت کو بڑھا ذوقِ نظر سے پہلے

جب سے خیالِ عالمِ میخانہ آگیا
گردش میں غور و فکر کا پیمانہ آگیا

گلشن نہیں جو طاقتِ فکر و نظر پڑے
اے دل سنبھل کہ کوچۂ جانانہ آگیا

تحقیق فرض ہوگئی ہر راہ رو پہ جب
کعبے کے راستے میں صنم خانہ آگیا

تفریق ہائے مذہب و ملت کو دیکھکر
دل کو پسند مشربِ رندانہ آگیا

میخانۂ جہاں کی حقیقت ہے اسقدر
گردش میں میری وجہ سے پیمانہ آگیا

رنج و الم سے ایک پریشان و مضطرب
بے حال تھا کہ سامنے میخانہ آگیا

حدِ جنونِ شوق سے آخر وفورِ غم
اتنا بڑھا کہ ہوش میں دیوانہ آگیا

بسمل کو جس پہ ناز تھا اے طالبانِ دہر
بربادیوں کے کام وہ کاشانہ آگیا

خود کو ذلیل و خوار کیا، ہائے کیا کیا
دُنیا کا اعتبار کیا، ہائے کیا کیا

محشر کا انتظار کیا، ہائے کیا کیا
وعدے پہ اعتبار کیا، ہائے کیا کیا

لکھی مرے نصیب میں صحرا نوردیاں
پھر واقفِ بہار کیا، ہائے کیا کیا

کچھ کجروؤں نے سبزۂ خوابیدہ روند کر
فتنے کو ہوشیار کیا، ہائے کیا کیا

اُس دل کو جس میں تیرے کرم کا ظہور تھا
محتاجِ روزگار کیا، ہائے کیا کیا

چمن میں آتشِ گُل پر فروغ پا کے چلے
ہوائے تند کے جھونکے قفس جلا کے چلے

ہوس رہی نہ اُنھیں پھر جہاں میں آنے کی ۔۔۔ جو زندگی کی حقیقت کو آزما کے چلے

چراغ دل کے بجھائے سے بجھ نہیں سکتے ۔۔۔ ہوا سے کہہ دو کہ دامن ذرا بچا کے چلے

جہانِ منزلِ مقصود خاک پائیں گے ۔۔۔ جو دوسروں کو رہِ شوق سے ہٹا کے چلے

کچھ اختیار نہ ملنے پہ اختیار رہے یہ
زمیں کے نیچے بسے آسماں پہ چھا کے چلے

پھر نشیمنِ بلبلِ بیکس کا نو تعمیر ہے ۔۔۔ بجلیوں کی چھاؤں میں برگشتہ تقدیر ہے

جس طرف جاتا ہوں ناکامی سے ہوتا ہوں دوچار ۔۔۔ مجھ سے گویا دو قدم آگے مری تقدیر ہے

چھوٹ کر زنداں سے باہر بیٹھے ہیں وحشی مگر ۔۔۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اب بھی پاؤں میں زنجیر ہے

اُس کی قدرت پوچھنا کیا جس کے ادنیٰ فیض کا ۔۔۔ ہر کرشمہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہے

ہم ہی خود واقف نہیں ترکیبِ استعمال سے
ورنہ اس دنیا کی جتنی خاک ہے اکسیر ہے

رازِ دنیازِ حُسن سے بیگانہ ہو گیا
دل اصطلاحِ عام میں دیوانہ ہو گیا

مسکن نہ پوچھ ایک غریب الدیار کا
تھک کر جہاں گرا وہی کاشانہ ہو گیا

ارمانِ حسن دل سے جو نکلا بہیں فنا
شمعِ سرِ مزار کا پروانہ ہو گیا

بسملؔ بقدرِ ظرف ملا دردِ عاشقی
ہر دل رہینِ جلوہ جانانہ ہو گیا

مرا کوچ اور قیام کیا سفرِ نشیب و فراز میں
کہ نظامِ راہِ حیات بھی تو ہے دستِ قافلہ ساز میں

بڑی کوششوں سے سمجھ سکا میں طلسمِ ناز و نیاز میں
کہ ازل کے روز عیاں ہوا جو نہاں تھا پردۂ راز میں

جو سببِ اذیتِ دل کا تھا وہی تیر یادِ کرم سے کھنچ گیا
مگر ایک بندۂ خاص کو نہ خبر ہوئی تو نماز میں

جو دھواں چراغ سے اُٹھتا ہے وہ زبانِ حال سے کہتا ہے
کہ ہزار دل. تل ہیں پڑے ہوئے شبِ غم کی زلفِ دراز میں

حُسن نے دُنیا رچا کر ناز سے
سانس لی اک مطمئن انداز سے

یہ صدا آئی شکستِ ساز سے
بیخبر ہوں زندگی کے راز سے

ہاتھ کیا آیا بنا کر آشیاں
پوچھتا ہے مائلِ پرواز سے

دل کے کچھ ٹکڑے بطورِ یادگار
لے چلے ہم جلوہ گاہِ ناز سے

حقیقت میں نگاہوں سے جو دیکھا کوئے دلبر میں
تو جلوہ عام تھا لیکن مذاقِ تنگ محشر میں

بھنور گردش میں آئے ہیں تو ہے ہر موج چکر میں
بسر کرنے کو ہمت چاہیئے غم کے سمندر میں

مئے وحدت کی کثرت وجہِ قلت ہو نہیں سکتی
ملی اتنی ہی گنجائش تھی جتنی جس کے ساغر میں

یہ مانا میں نے جزو و کل میں ہے بیّن فرق، ہے لیکن
اُسے قطرہ نہیں کہتے جو مل جائے سمندر میں

آخری غزل

رنگِ دنیا اتنی تیزی سے بدلتا جائے ہے
اب نہ دیکھا جائے ہے مجھ سے نہ سمجھا جائے ہے

ہر نفس بخشے ہے اہلِ دہر کو تازہ پیام
کام بڑھتا جائے ہے اور وقت گھٹتا جائے ہے

موت کی منزل وہ منزل ہے کہ جسکے شوق میں
کاروانِ زندگی دن رات چلتا جائے ہے

زندگی آتش بداماں آرزو دامن کشاں
اب نہ اٹھا جائے ہے مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے

سعیِ گوہر کا نتیجہ جو بھی ہو فی الحال تو
دامنِ ساحل مرے ہاتھوں سے چھوٹا جائے ہے

اجتماعی زندگی بافیض ہو سکتی ہے جب
ہر نفس دیکھے کہ کس کے پاس سے کیا جائے ہے

بڑھتا جاتا ہے دلِ بسمل کا جتنا اضطراب
زندگی کا مرحلہ دشوار ہوتا جائے ہے

متفرق اشعار

جس کسی نے دہر میں چشمِ حقیقت باز کی — سب سے پہلے اپنی ہستی خود نظر انداز
اور پیچیدہ ہوا دل میں طلسمِ آرزو — دیکھکر رنگینیاں حسنِ کرشمہ ساز کی
شان اُس کی ہر کرم اُس کا ہی قدرت اسکی ہے — صورتیں جسنے بنائی مختلف انداز کی

دل آزاریوں پہ دل آزاریاں ہیں — محبت کی منزل ہے دشواریاں ہیں

عینِ فطرت ہے کہ گاہے صبح گاہے شام ہو — یعنی دنیا مبتلا گردشِ ایام ہو
عہد گمنامی میں تو پیدا ہوا گمنام ہو — زندگی کا راز ہی کیا ہے جو طشت از بام ہو

دنیائے حوادث ہے اور حسن کا جلوہ ہے — ذرّوں میں نہاں دل ہیں ہر دل میں تمنا ہے
جو حق کے تلاشی ہیں خود اپنی طرف دیکھیں — اک بات ہے سیدھی سی قطروں ہی میں دریا ہے
دشمن سے بھی دشمن کو خالق نہ دکھائے وہ — جو کچھ شبِ غم ہمنے ان آنکھوں سے دیکھا ہے

گو خود مجھے ہر کام کا مقدور نہیں ہے　　بندہ مگر اُس کا ہوں جو مجبور نہیں ہے

اسیرِ قفس طالبِ رنگ و بو ہے　　عجب زندگی ہے عجب آرزو ہے

سر میں سودائے محبت شوقِ طاعت دل میں ہے
ذرہ ذرہ سر بسجدہ کوچۂ قاتل میں ہے
شب کو تھی کچھ اور ہنگام سحر ہے اور کچھ
سچ ہے جیسا وقت ویسی روشنی محفل میں ہے
شمع گل ہونے سے جلوے نے بدل ڈالا لباس
جامۂ تاریک پہنے روشنی محفل میں ہے

غیر سے مجھکو گلا اپنوں سے بھی شکوا نہ تھا　　میری دنیا تھی میں جبتک طالبِ دنیا نہ تھا
ڈھونڈھتا پھرتا تھا کسکو جلوہ گاہ عام میں　　منظرِ حسنِ حقیقی میں اگر بھولا نہ تھا

ناکام زندگی کا اثر دیکھتا ہوں میں
دنیا بدل رہی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
عقل و خرد کو خاک بسر دیکھتا ہوں میں
جلوے بہ اعتبارِ نظر دیکھتا ہوں میں
بڑھ جاتی ہیں کچھ اور بھی منزل کی مشکلیں
جب اپنا زادِ راہِ سفر دیکھتا ہوں میں

فصلِ گل دیکھی کراماتِ بیاباں دیکھے
دل بہلنے کے نہ لیکن کہیں ساماں دیکھے
جتنے جلوے سرِ گلزار نمایاں دیکھے
اُن سے زائد دلِ بیتاب میں ارماں دیکھے
ذرّے ذرّے سے ملے درسِ اُخوت سبکل
طرزِ تشکیل اگر غور سے انساں دیکھے

رباعیات و قطعات

آغاز کو حیرت کی نظر سے دیکھو انجام کو عبرت کی نظر سے دیکھو
ماحول کو خالق کا عطیہ سمجھو ہر چیز محبت کی نظر سے دیکھو

ناپید زمانے سے وفاداری ہے یہ ضرب محبت کیلئے کاری ہے
قائم تھا کبھی ربط دل و جاں لیکن اب سانس کے لینے میں بھی دشواری ہے

پینے کی تمنا میں گلابی دیکھی رنگت گلِ عارض کی شہابی دیکھی
جب حرص کے ہونٹوں سے لگا جامِ شراب میخانۂ حسرت کی خرابی دیکھی

اخلاق شکنجے میں کسا جاتا ہے بک دیتے ہیں جو ذہن میں آجاتا ہے
ہم ایسے ادب سے باز آئے جس میں اللہ کو بھی فرض کیا جاتا ہے

دوزخ کا مضحکہ اُڑانے والے دنیا کو غلط راہ دکھانے و
پائیں گے ضرور ہرزہ سرائی کی سزا نمرود کے ہم طرز زمانے و

اپنے عہدِ وفا کو بھول گئے اُس کی شانِ عطا کو بھول گ
رنگِ دنیا بدل گیا بسمل جب سے بندے خدا کو بھول گ

نفس کیا شے ہے اور نفس کیا ہے طرزِ تخئیل نکتہ رس کیا
کیوں بنے جان پر اگر سمجھیں عشق کیا چیز ہے ہوس کیا

نشے میں زندگی کے چور ہوئے اتنا بھکے کہ لاشعور ہو
یہ عذرِ ارتقا ارے توبہ ! لوگ انسانیت سے دور

گردشوں کا اثر نہیں لیتے — نہ کبھی وقفِ یاس ہوتے ہیں
اپنے دل پر نگاہ رکھتے ہیں — جو زمانہ شناس ہوتے ہیں

غالب و میر و مصحفی نہ رہے — آتش و ناسخ و دبیرؔ نہ رہے
دل فراموش کر چکا تھا جنھیں — اُن کی یاد آئی جب صفیؔ نہ رہے

حسب ذیل قطعات بسملؔ صاحب مرحوم نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو
کی خدمت مین انکی سالگرہ کے موقع پر بطور ہدیہ بھیجے تھے

ساکنانِ جہانِ خستہ حال — تا بہ کے ایں جنونِ جنگ و جدال
زندہ باد اے نقیبِ امن و امان — فخرِ ہندوستان جواہر لال

دیگر

رنگ تفریق کو مٹا کے چلو — بات بگڑی ہوئی بنا کے چلو
تم کو چلنا ہے وقت کے ہمراہ — ہندوالو قدم ملا کے چلو

نظم جو استادِ معظم لسان القوم مولانا صفیؔ مرحوم کے سویم کے دن ناظم صاحب کے امامباڑہ میں پڑھی گئی

افسوس کا مقام ہے اے شہر لکھنؤ
پستی کے گہرے غار میں اتنا گرا ہے تو

تہذیب تیری قصۂ پارینہ ہو چکی
انسانیت کی قبر پہ جی بھر کے رو چکی

اخلاق تیرا جو تھا پسندیدۂ جہاں
اب اسکا ڈھونڈھنے سے بھی ملتا نہیں نشان

سچ تو بتا یہ سب ترے اوصاف کیا ہوئے
جو وجہ زندگی تھے وہ افلاک کیا ہوئے

مر جائے تیرا چاہنے والا تو غم نہیں
اے ناشناس فرض تغافل یہ کم نہیں

دنیا کی آرزو میں گرفتار ہے اگر !
پائیگا دم زدن کیلئے بھی نہ تو مفر

یہ چلتی پھرتی چھاؤں بھروسے کی جا نہیں
تجھ میں وفا نہیں تو اسے بھی بقا نہیں

اتنا کہا تھا میں نے کہ آئی ندائے غیب
نادان کوئی بات نہیں اب جہاں میں عیب

آگاہ ہو کہ رنگ زمانہ بدل گیا
اذبر ہے جو تجھے وہ فسانہ بدل گیا

سہرا

بتقریب شادی عزیزی ساجد رضا صاحب طول عمرہٗ خلف اکبر جناب مہدی رضا صاحب زاد عنایتہ

جن کی کد و کاوش سے یہ مجموعہ چھپنے کی نوبت تک پہونچا

کیوں نہ ہو نور ریاضت سے منور سہرا — فخر اللہ شکر کا ساجد کے رہا سر سہرا
اپنے بیگانے جسے جانِ وفا کہتے ہیں — ایسے نوشاہ کا کیونکر نہ ہو دلبر سہرا
رخِ نوشہ سے اگر حسن کا جلوہ ہو عیاں — تو گلستانِ محبت کا ہے جوہر سہرا
آب و تاب اس کی بتاتی ہے سرِ بزمِ شہود — بحرِ ذخارِ حقیقت کا ہے گوہر سہرا
پائیداریٔ محبت کا پتہ دیتا ہے — بوئے گلہائے رفاقت سے معطر سہرا
یہ لطافت کا کرشمہ ہے سرِ محفلِ ناز — کہ بنا فخر و مباہات کا پیکر سہرا
دائرہ ایک بنا رکھا ہے احباب نے اور — گردشِ چشمِ تمنا کا ہے محور سہرا
للہ الحمد بنا شاہدِ مقصودِ وقار — حدِ امکانِ تخیل سے گذر کر سہرا
جوشِ الفت کا تقاضا ہے کہ کلیاں کِھل جائیں — دیکھنے آئے ہیں مہندی و دولا ور سہرا

دینِ رضا جب بخوشی اُن کو علی و حیدر
باندھیں نوشہ کے نہ کیوں عابد و صفدر سہرا

خادم و آلِ رضا بزم میں مسرور ہوئے
جب بندھا ساجد خوش فہم کے سر پر سہرا

مصطفےٰ اور محمد کی خوشی کے ہمراہ
شوق سے دیکھتے ہیں باقر و جعفر سہرا

ماجد و یوسف و زاہد ہیں مسرت میں شریک
کیوں نہ ہو نیر اقبال کا مظہر سہرا

رہ گئے صابر و آصف تو بفضلِ خالق
شادماں ہیں کہ بندھا بھائی کے سر پر سہرا

سرپرستی میں بزرگوں کی وہ دن لائے خدا
کہ بندھے خورد و کلاں کے یونہی سر پر سہرا

فکرِ تاریخ جو لاحق تھی دلِ بسمل کو
کہا ہاتف نے کہ "ہے سابق و خوشتر سہرا"

۱۹۵۶ء

جو میونسپلٹی میں حسینؑ ڈے کے لیے مرحوم نے کہا تھا مگر پڑھا نہیں

سلام اُن پر جو حق کے کام آئے — وفا کے نام پر خوں میں نہائے
پھرا جب ظلم کا خنجر گلوں پر — زمانے کی روش پر مسکرائے

چلے ہیں نصرتِ حق کو امام عرش مقام — ہزار بار درود اور لاکھ بار سلام
ہوئی جہاں پر ظاہر صداقتِ اسلام — مگر حسینؑ کی مظلومیت جب آئی کام
ہرا رہے ہیں اسی وجہ سے جہاں کے عوام — کہ رنج و غم میں نہاں ہے حسینؑ کا پیغام
زبانِ حال سے کہتی ہے گردشِ ایام — مٹا ہے اور نہ مٹے گا کبھی حسینؑ کا نام
یہ کون کہتا ہے بے بس تھے ہو گئے ناکام — دیا حسینؑ نے جاں دے کے زندگی کا پیام
حدودِ حشر سے ٹکرائی جب حدِ آلام — دہم تھی ماہِ محرم کی عصر کا ہنگام
غمِ حسینؑ کی تاثیر پوچھنے والو! — پہنچ رہا ہے جہاں بھر میں کربلا کا پیام
بتائیے کہ ہم انساں انھیں کہیں کیونکر — جو مہماں پہ کریں بند آب و طعام
نبیؐ کا لختِ جگر تھا علیؑ کا نورِ نظر — زمانے بھر کی مصیبت ہوئی تھی جس پہ تمام
مجال کس کی کہ تشریح کر سکے اس کی — کیا تھا ناوکِ بیداد نے جو قطعِ کلام
سوال آج بھی ہوتا ہے یہ کہ ہم میں سے — سنا ہے کتنوں نے دل سے حسینؑ کا پیغام
حسینؑ اب بھی ہیں فرماں روائے کرب و بلا — مگر یزید سے خالی ہے تختِ کوفہ و شام
غمِ حسینؑ میں نکلے جو چشمِ تر سے — طمانیت کا سبب ہوں گے حشر کے ہنگام

حمد و نعت و منقبت

نمودِ ازل تھی جو رحمت کسی کی — تو روحِ رواں تھی محبت کسی کی
بنی جان و دل پہ تو یہ راز سمجھا — کہ مٹنے سے ہوتی ہے قربت کسی کی
وہ راحت کا عالم ہو یا غم کی دُنیا — کرم ہی کرم ہے مشیت کسی کی
ابھی دیکھئے گُل کھلاتی ہے کیا کیا — یہ کثرت کے پردے میں وحدت کسی کی
فلک بوس نعرے ہیں صلِّ علیٰ کے — کہ وردِ زباں تھی حکایت کسی کی
قمر سے یہ پوچھو کہ ہوتی ہے کیونکر — اشارے سے تکمیل حُجّت کسی کی
نہ تھا مثل جس کا نہ تھا جس کا سایہ — وہ نورِ مجسم تھی خلقت کسی کی
قدم جس کے چومے ہیں عرشِ بریں نے — کوئی کیا بتائے وہ رفعت کسی کی
گنہگار ہونے پہ بھی سچ تو یہ ہے — ہزاروں سے بہتر ہے اُمت کسی کی
بدل جائے دم بھر میں دنیا کا نقشا — مسلماں کریں گر اطاعت کسی کی
اصولِ وفا غیر اپنا رہے ہیں — عیاں ہو رہی ہے صداقت کسی کی
بتاتا ہے رنگِ تضادِ زمانہ — کہ دوزخ کسی کی ہے جنت کسی کی

یہی دونوں باتیں ہیں بانیٔ محشر
خطائیں ہماری شفاعت کسی کی

ذرا اختیارِ نبوت تو دیکھو
خدائی کسی کی، حکومت کسی کی

پڑھوں منقبت میں نہ کیوں اب وہ مطلع
کہ جس سے عیاں ہو جلالت کسی کی

وہ ہجرت کی شب استراحت کسی کی
رسالت نما تھی امامت کسی کی

پڑھو بابِ خیبر پڑھو فصلِ خندق
حدیثوں میں دیکھو شجاعت کسی کی

ریاضت کی تھی ایک روشن نشانی
کسی کی وہ غار اور وہ رجعت کسی کی

رہی طاعتِ ہر دو عالم سے افضل
وہ خندق کے دن ایک ضربت کسی کی

دہن زخم کا چپ ہے ناوک بھی ساکت
کہے کون شانِ عبادت کسی کی

نہ کیونکر رہے یادگارِ زمانہ
غریبوں کی دنیا میں خدمت کسی کی

بنی انتہا کے نگینے کی زینت
عبادت میں شانِ سخاوت کسی کی

نکل جائے دم یا علیؓ تیرے در پہ
ٹھکانے لگے کاش محنت کسی کی

جو نسبت تھی ہاروں کو موسیٰ سے پہلے
وہی تھی بنائے امامت کسی کی

قصیدہ

مسرّتِ عطا کی اگر ابتدا نے | تو دنیا بدل دی غمِ انتہا نے
حریصِ گلستاں کبھی تو یہ جانے | نہ یہ گل رہیں گے نہ یہ آشیانے
حقیقت ہی ہے دل حقیقت ہی آخر | حقیقت کا مقصد حقیقت ہی جانے
گلستاں میں رہ کے گزاری ہے کیونکر | پتہ دے رہے ہیں جلے آشیانے
یونہی آنے والے یونہی جانے والے | بہاروں کے عالم خزاں کے زمانے
یہ رنگینیاں پھر نہ رہتیں چمن کی | جو بنکر نہ مٹتے کبھی آشیانے
اگر جانتے حدِ سوزِ محبت! | نہ آتے وہ میرا نشیمن جلانے
شبِ عیش و عشرت کے اے سونے والو | فلک پر ستارے لگے جھلملانے
تغیر کے ہاتھوں میں ہے رنگِ گلشن | بدلتے چلے جا رہے ہیں زمانے
زمانے کی گردش غریبوں کے گھر میں | چراغوں کے بدلے لگی دل جلانے

یہ عالم ہے جب رنگِ دنیا کا تسبل
تو پھر رمزِ عقبیٰ کوئی کیوں نہ جانے

وہ عقبیٰ کہ جس کی بقا کے فسانے
سُنائے ہمیں اشرفُ الانبیا نے

نبیِ معظمؐ وہ جن کے کرم سے
ملے دردمندوں کو جو وہ ٹھکانے

ٹھکانے بھی ایسے کہ پردوں میں جنکے
چھپائے ہیں رازِ حقیقت خدا نے

بہ تاثیرِ ذکرِ خدائے دو عالم
قدم معصیت کے لگے ڈگمگانے

قیامت کا ہنگام پیشِ نظر ہے
یہ دن بھی دکھایا ہماری خطا نے

غنیمت سمجھئے کہ چلتی ہیں نبضیں
قضا ڈھونڈھتی ہے ابھی تک بہانے

خرد کا تقاضہ ہے اُس راہ چلیئے
جو چل کر دکھائی ہے خیر الورا نے

حیا کے وفا کے سخا کے طریقے
بتائے ہیں بنتِ رسولِ خدا نے

بسر کس طرح ہم کریں زندگانی
یہ مشکل بھی حل کر دی مشکلکشا نے

ہوں اخلاق و عادات کیسے ہمارے
سکھایا جنابِ حسنؑ کی رِدا نے

اگر آنچ حق اور صداقت پہ آئے
دکھائی ہے راہِ عمل کربلا نے

مصائب کے اوقات کیونکر گذاریں
بتایا ہمیں حضرتِ زین العبا نے

رموزِ علومِ الٰہی بتا کر — کیا باخبر باقرِ باخدا نے
صداقت، دیانت، امانت کے جوہر — دکھائے ہمیں جعفرِ باصفا نے
تحمل، توکل کی باتیں بتائیں — اسیری میں موسیٰؑ کاظم رضا نے
طریقے جہانبانیوں کے سکھائے — غریبوں کے مولا جنابِ رضاؑ نے
جنابِ تقیؑ آئے ہم عاصیوں کو — طہارت کا پاکیزہ مطلب بتانے
امامِ دہمؑ ہیں وہ معصوم جن کو — لطافت کا خلعت پنہایا خدا نے
مددگارِ امت حسن عسکریؑ ہیں — دی فوجِ ملائک جنھیں کبریا نے
امامِ زمانہ وہ رہبر ہیں جن کو — حفاظت میں اپنی رکھا ہے خدا نے
اگر پیروی ہم کریں دل سے اُنکی — پلٹ آئیں عزت کے گذرے زمانے
فقط ہم سے عزم و عمل چاہتے ہیں — وہ احساں کئے ہیں جو آلِ عبا نے
بنے کام بگڑا جو اتنا سمجھ لیں — ہم آئے ہیں فرقِ من و تو مٹانے
خدایا ہمیں پھر وہ طاقت عطا کر — کہ دنیا پہ سرکش لگے سر جھکانے
پریشانیِ دل کا تقاضا ہے سمجھیں — مدینے چلو اپنی بگڑی بنانے